NOVEMBER
2025

جدید تر ادب کا شارح

ماہنامہ

بیاض

لاہور

اکبر الہ آبادی، علامہ محمد اقبال، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، شکیب جلالی، پروین شاکر

سالگرہ مبارک

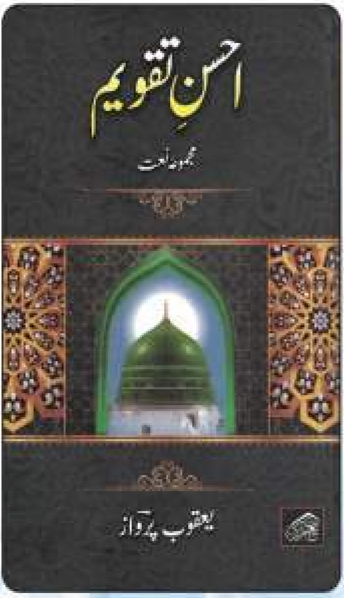
احسنِ تقویم
مجموعہ نعت
یعقوب پرواز

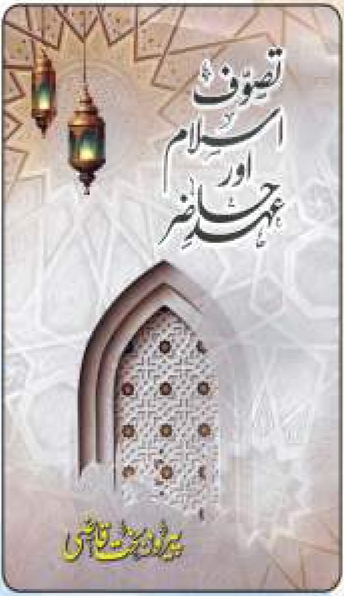
تصوف
اسلام
اور
عہدِ حاضر

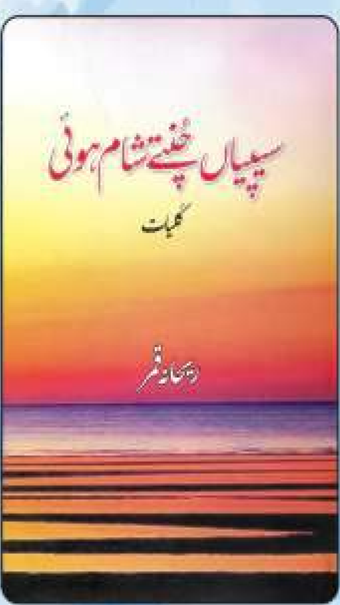
سیپیاں چنتے شام ہوئی
کلیات

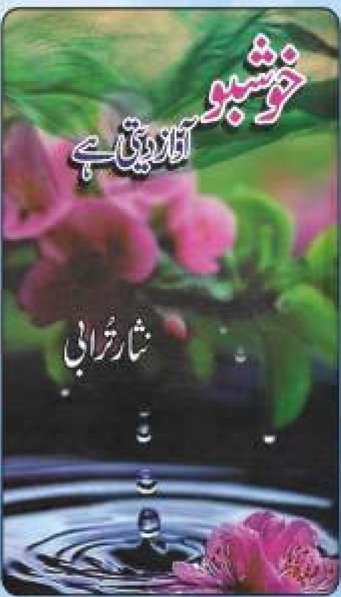
خوشبو
آواز دیتی ہے
نثار ترابی

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

سرِ حیات اک الزام دھر گئے ہم بھی
کلام بھی جیا اور مر گئے ہم بھی

یہ عہد ایک مسیح نفس میں زندہ تھا
رہا نہ وہ بھی سلامت ، بکھر گئے ہم بھی

چمک اُٹھا تھا وہ چہرہ دھڑک اُٹھا تھا یہ دل
نہ اس نے راستہ بدلا نہ ٹھہر گئے ہم بھی

بتوں کی طرح کھڑے تھے ہم اک دوراہے پر
رخ اس نے پھیر لیا ، چشم تر گئے ہم بھی

کچھ ایسے زور سے کڑکا فراق کا بادل
لرز اُٹھا کوئی پہلو میں ، ڈر گئے ہم بھی

جدائی میں بھی ہم اک دوسرے کے ساتھ رہے
کڈھب رہا نہ وہ خالد سنور گئے ہم بھی

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL

Freight Forwarding

Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 37083901-9
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5252311 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - نومبر 2025 - شمارہ نمبر: 11

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: بیلم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: اکبر الہ آبادی، علامہ محمد اقبال، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، شکیب جلالی، پروین شاکر

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ڈی ایچ اے ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

A/c Title: Monthly BAYYAZ

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور نے پبلشر و پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد شیخ دین اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	اکرم سحر فارانی، خالق آرزو	7 تا 8
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، نسیم سحر، شوکت محمود شوکت اکرم سحر فارانی، سرور حسین نقشبندی، محمد سلیم ساگر صغیر احمد صغیر، محمد افضال انجم، اسد رضا سحر	9 تا 18
3	عقیدت	احمد جلیل، مرزا آصف رسول	19 تا 20
4	رباعیات	محمد نصیر زندہ، سعید اشعر	21 تا 22
5	ماہیے	خاور اعجاز	23
6	دوہے	سعید اشعر	24
7	افسانے	بلقیس ریاض، [باسل فرینڈو — ترجمہ: حمزہ حسن شیخ] شاہ روم خان ولی، بابر اشتن ابر، اقرا مشتاق مرزا صہیب اکرام، رانا محمد شاہد	25 تا 46
8	شکر کی چھاؤں [ناولٹ]	صفورو پرویز	47 تا 54
9	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، سید ریاض حسین زیدی خاور اعجاز، سید افسر ساجد، شریف ساجد، اجمل اعجاز گلزار بخاری، نثار ترابی، مسعود احمد، طالب انصاری قیوم طاہر، شاہنواز زیدی، احمد جلیل، عقیل رحمانی، افروز رضوی	55 تا 126

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	رخشندہ نوید، خالدہ انور، رضا اللہ حیدر، شوکت محمود شوکت سرفراز تبسم، ثمینہ سیّد، اکرم سحر فارانی، مظہر اعجاز مظہر علمدار حسین، راجہ عبدالقیوم، اصغر علی بلوچ، افضل ہزاروی اقبال قمر، اکرم ناصر، انصر حسن، اعجاز روشن، ابو طالب انیم فیض رسول فیضان، نبیل احمد نبیل، سید تیمور کاظمی، آصف شفیع بشیر احمد حبیب، وسیم جبران، ظہور چوہان، مرزا عاصی اختر شکیل جاذب، محمد اشفاق بیگ، شگفتہ نعیم ہاشمی، اعجاز روشن ہمایوں پرویز شاہد، طاہر حنفیؔ، سمیع اللہ عرفی، ذکی طارق سعدیہ بشیر، عابد رضا، امجد بابر، متحسن جامی، سید تحسین گیلانی اکرم جاذب، قمر نیاز، ارشد محمود ارشد، سرور فرحان، نبیل قیصر عقیل شافی، نوید عاجز، نائلہ راٹھور، عبدالرؤف زین کشمالہ گیلانی، عطاالعزیز، اسد رضا سحر، حسن پرویز سیّد احمد ساقی، طلحہ غفور، عزیز قدیر مغل، اعجاز رضوی	55 تا 126
10	مضامین	محمد ارشاد، جلیل عالی، نسیم سحر، اسلام عظمی، سید طاہر شیرازی طالب انصاری، مظفر حسین اختر، [خالد سہیل + امیر حسین جعفری] تنویر قاضی، علی ارمان، ثمینہ سیّد، جسارت خیالی، شمیم حیدر ترمذی کاوش صدیقی، نوید عاجز، آبگینہ شاہین، صبا اسلم، نوید صادق	127 تا 206
11	حلقۂ دامِ خیال [سفرنامہ]	اقبال خان یوسف زئی	207 تا 214
12	غم ورثہ ہے ناولٹ	دردانہ نوشین خان	215 تا 222
13	نظمیں	جلیل عالی، سید افسر ساجد، فیاض حسین، مسعود احمد، تنویر قاضی احمد جلیل، امیر حسین جعفری، رخشندہ نوید، علی ارمان، شہباز خواجہ سمیع اللہ عرفی، امجد بابر، فیض رسول فیضان، صغیر احمد صغیر، نائلہ راٹھور بشریٰ شیریں، مسکان گل، عاصم بخاری، محمد عبداللہ، اعجاز رضوی	223 تا 241

حمد

کل بھی یکتا آج بھی یکتا تیرا نور
بستی بستی قریہ قریہ تیرا نور

تیری عظمت کیسے سمجھے گا اِنسان
سوچ کی رفعت سے ہے بالا تیرا نور

عرش پہ جس کا نام ہے تیرے نام کے ساتھ
اُس کی پیشانی پر چمکا تیرا نور

ذرّہ ذرّہ نورِ سحر میں ڈوب گیا
بحرِ ظلمت میں جب پھیلا تیرا نور

نورِ ایماں نورِ وحدت عام ہوا
خاکی پیکر نے جب پہنا تیرا نور

بُت خانوں میں بس گئیں کرنیں وحدت کی
ذرّوں میں خورشید نے بانٹا تیرا نور

چمکا نور تو ہم نکلے گمراہی سے
رُشد و ہدایت کا سرچشمہ تیرا نور

سب غفلت کے مارے محوِ خواب رہے
ہر چشمِ بیدار نے دیکھا تیرا نور

اکرم سحر فارانی

حمد

اے خدا تجھ کو لامکاں دیکھا
تو ہی تو ہے جہاں جہاں دیکھا

کیا ٹھکانہ ہے تیری رحمت کا
اپنے بندوں پہ مہرباں دیکھا

تیرے بندوں پہ جس نے ظلم کیا
پھر نہ اس کا کہیں نشاں دیکھا

تیری ہر اک جگہ نشانی ہے
ہر جگہ تجھ کو ہی نہاں دیکھا

اس کے دیدار کی طلب خالقؔ؟
موسیٰ نے بھی اسے کہاں دیکھا

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

نعتؐ

این و آں کے سب خزانے، دولت جنت ملی
آپؐ کے قدموں میں جس کو آپؐ کی صحبت ملی

کر دیے ہیں غم غلط سب آپؐ کے افکار نے
مطمئن ہیں جسم و جاں وہ آپؐ کی رحمت ملی

آپؐ کی نوری جھلک شادابیاں برسا گئی
خوابِ خوش! مژدہ تجھے، دارین کی لذت ملی

خفتہ و بے حال انساں کیا سے کیا ہوتے گئے
چشمِ دل ان کی کھلی، کیف آفریں حیرت ملی

آپؐ کے رحمت فزا کردار ہی کا فیض ہے
روح پرور کیف و مستی، بہجت و راحت ملی

ان کے صدقے خاک کو کیا دلکشا پیکر ملا
عشق کی قوت ملی، ایمان کی دولت ملی

آپؐ کے افکار سے بابِ تخیل کھل گیا
دل گداز عشق کو رقت ملی، وسعت ملی

ہر خس و خاشاک سے آئینہ جاں دھل گیا
ہر طرف توحید کے تذکار سے عفت ملی

گل فشانی دیگر اصنافِ سخن میں بھی ہوئی
ہے یہ حرفِ حق ریاضِ نعت کو عزت ملی

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

چراغ ، شمع ، دِیا ، روشنی مرے آقاؐ
کتاب ، علم ، عمل ، آگہی مرے آقاؐ

سکونِ قلب و نظر آپؐ سے مِلا ورنہ
عجیب خوف میں تھی زندگی ، مرے آقاؐ

اگر یہ نعت کی مصری نہ مِل گئی ہوتی
تو بے مزا تھی مری شاعری مرے آقاؐ

کسی کلاہ نہ دستار سے غرض ہم کو
ہمارا فخر ہیں بس آپ ہی مرے آقاؐ

مجھے مدینے سے مِلتی رہے صبا آ کر
کِھلی رہے مرے دل کی کلی مرے آقاؐ

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرخ ہوئے، پھر نور نمو سے، پھولوں کے رخسار
عکس جمال یار سے ٹھہرا ، ہر چہرہ گلنار

نعتؐ

ہر شے میں جھلکتا ہے مکاں اور زماں میں
"سرکارِ دو عالم کا حوالہ ہے جہاں میں"

محبوبِ خداؐ کا یہی رتبہ ہے خصوصی
موجود ہمیشہ سے وہؐ ہیں کون و مکاں میں

اللہ کے محبوبؐ کا منصب ذرا دیکھو
شامل ہے یہی اسمِ مبارکؐ بھی اذاں میں

موضوع کوئی اور نہ چھیڑو کہ ابھی مَیں
مصروف ہوں سرکارؐ کی سیرت کے بیاں میں

جگمگ ہے زمانے میں اسی نام سے اب تک
اک اسمِ محمدؐ ہی درخشاں ہے جہاں میں

اے میرے نبیؐ، اس پہ دوبارہ ہو عنایت
اُمّت بڑی بے سروساماں ہے جہاں میں

یہ نور تسلسل ہے فقط غارِ حرا کا
لاریب اسی سے تو چراغاں ہے جہاں میں

ہر سمت مجلّٰی ہے وہی اسمِ منوّر
حقاؐ، کہ ضیاء بار وہی کاہکشاں میں

اپنا تو نسیمِ سحر ایمان یہی ہے
ہر لمحہ رکھیں گے وہ ہمیں اپنی اماں میں

نسیمِ سحر

نعتؐ

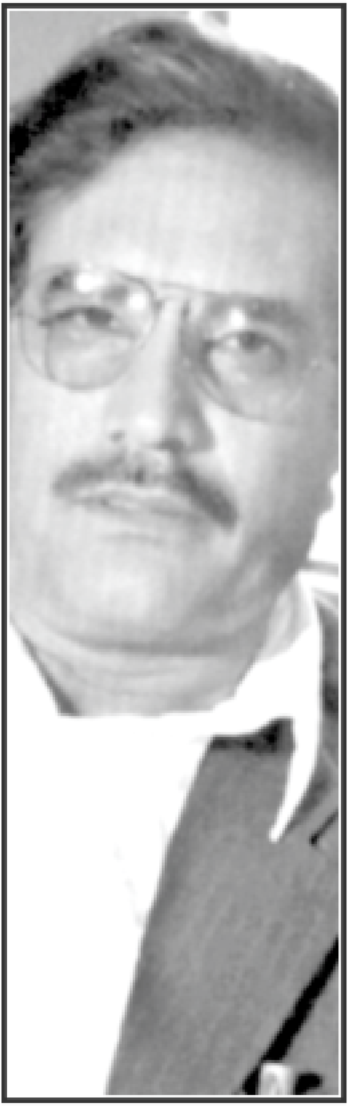

شام ہو یا وہ سحر ہو، بس بسر طیبہ میں ہو
ایک چھوٹا سا مگر، اپنا بھی گھر طیبہ میں ہو

بادشاہی کل جہاں کی، کب مجھے مطلوب ہے
یہ دعا ہے کاش! مجھ سا بے ہنر طیبہ میں ہو

جو بھی پہنچا شہرِ طیبہ، وہ ہوا مامون پھر
یہ نہیں ممکن اسے پھر جاں کا ڈر طیبہ میں ہو

ہو نہیں سکتا کسی صورت مریضِ لا دوا
وہ مریضِ عشق جس کا چارہ گر طیبہ میں ہو

شہرِ طیبہ ہی میں ہو، ہر زخمِ دل کا اندمال
ہر دوائے قلبِ خستہ بارور طیبہ میں ہو

ذرۂ بے قدر جس کی ہو نہیں قیمت کوئی
ہے یقیں محکم کہ وہ جا کر گہر طیبہ میں ہو

جانِ شوکت پر ہوا ہے عشقِ طیبہ کا اثر
وہ رہے چاہے جہاں بھی، دل مگر طیبہ میں ہو

شوکت محمود شوکت

نعتؐ

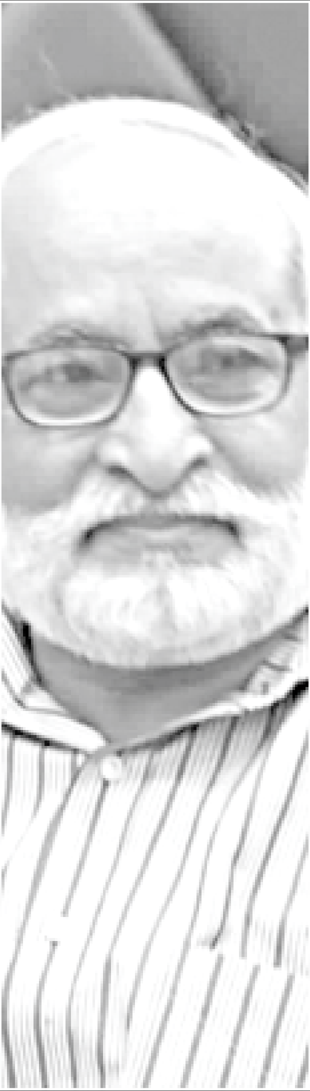

دورِ شر کا مٹا آ گئے مصطفیٰؐ
بن کے خیرالوریٰ آ گئے مصطفیٰؐ

عرش والو، سنو فرش والو سنو
آ رہی ہے صدا آ گئے مصطفیٰؐ

تھرتھرانے لگی کفر کی سلطنت
بن کے فرماں روا آ گئے مصطفیٰؐ

جاں بہ لب جب تھی بیمار اِنسانیت
لے کے آبِ شفا آ گئے مصطفیٰؐ

پائے جرأت کو ایقانِ منزل ملا
بن کے جب رہنما آ گئے مصطفیٰؐ

آپؐ معراج پر جب روانہ ہوئے
قدسیوں نے کہا آ گئے مصطفیٰؐ

چلچلاتی ہوئی دھوپ میں حبس میں
لے کے ٹھنڈی ہوا آ گئے مصطفیٰؐ

شامِ غم کٹ گئی ہو گئی ہے سحر
شور برپا ہوا آ گئے مصطفیٰؐ

اکرم سحر فارانی

نعتؐ

ہری ہر شاخ ہو ایک ایک پتا سبز ہو جائے
مرے آقا مرا نخلِ تمنا سبز ہو جائے

خیالوں میں سما جائے کچھ ایسے گنبدِ خضرا
نمو پائیں جو مصرعے خود سے چہرا سبز ہو جائے

شرف مجھ کو عطا ہو آپ کو مدحت سنانے کا
مرے آقا مرا بھی ایک سپنا سبز ہو جائے

ہر اک صنفِ سخن میں آپ کی مدحت کے گل مہکیں
شجر میرے سخن کا بھی کچھ ایسا سبز ہو جائے

یہاں چھائی ہی رہتی ہے سدا پژمردگی دل پر
مدینے میں پہنچ جاؤں تو دنیا سبز ہو جائے

لبوں پر اسمِ احمد ہو، دہن میں شہد گھل جائے
مدینے کا تصور ہو تو صحرا سبز ہو جائے

شہِ والا کی امت کو عطا ہو عظمتِ رفتہ
خدایا خشک آنکھوں کا یہ رونا سبز ہو جائے

مرے اطراف کھل اٹھتے ہیں غنچے نو بہ نو سرورؔ
ثنا کی راہ پر نکلوں تو رستہ سبز ہو جائے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

وابستہ غزل ہی نہیں جینے سے ہمارے
نعتیں بھی نکلتی ہیں خزینے سے ہمارے

دل قوسِ قزح، گنبدِ خضرا کے عقب میں
صد رنگ مراسم ہیں مدینے سے ہمارے

کیا لفظ نمودار ہوئے نعت میں ڈھل کر
کیا روشنی پھوٹی ہے نگینے سے ہمارے

لو اشک چھلکنے لگے اک نام کو سُن کر
لو بوجھ اُترتا ہے سفینے سے ہمارے

ہم رازِ غمِ عشق چھپا لائے تھے دل میں
زم زم کو خبر ہو گئی پینے سے ہمارے

اک عکس کہ لرزاں رہا اشکوں میں ہمیشہ
اک یاد کہ لپٹی رہی سینے سے ہمارے

کیا خواب میں دیکھا ہے کہ تا حشر یہ دُنیا
اب خواب بھی دیکھے گی قرینے سے ہمارے

کہتا ہے کہ طیبہ کی مہک آتی ہے ساگرؔ
جو عطر بناتا ہے پسینے سے ہمارے

محمد سلیم ساگر

نعتؐ

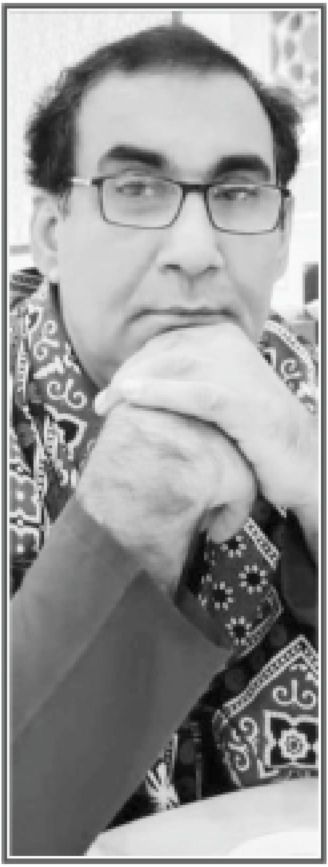

ذکرِ صلِّ علیٰ کہاں تک ہے
میرا ایماں ہے لامکاں تک ہے

آپ کی ذات وہ نہیں سمجھا
جو سمجھتا ہے کن فکاں تک ہے

ذرہ ذرہ سلام پڑھتا ہے
یہ زمیں آسماں جہاں تک ہے

آپ کے ہیں جہاں جہاں بھی غلام
ان کی رحمت وہاں وہاں تک ہے

روزِ محشر حضور ہوں گے وہاں
جو بھی غم ہے اسی جہاں تک ہے

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسمِ مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ وَرق پہ کاہ کشنِ سخن تمام

نعتؐ

اے سیدِ ابرار تیرے در پہ کھڑے ہیں
ہم طالبِ دیدار ترے در پہ کھڑے ہیں

مصدر ہے بہ جز کون ترے، جود و سخا کا
ہے بھیک پہ اصرار ترے در پہ کھڑے ہیں

یاں آنے کے ہرگز بھی سزاوار نہیں ہم
ہم پھر بھی شرمسار ترے در پہ کھڑے ہیں

ہم چھوڑ کے دامن ترا رسوا ہیں جہاں میں
اس سے نہیں انکار ترے در پہ کھڑے ہیں

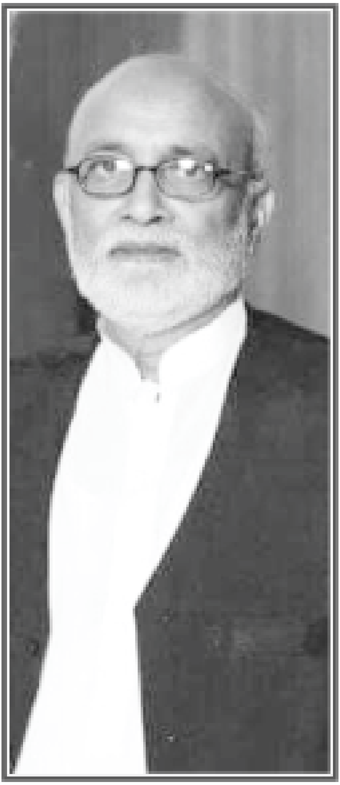

دنیا کا مرض کیا ہے جو لاحق نہیں ہم کو
صحت کے طلب گار ترے در پہ کھڑے ہیں

روکے رہی دنیا کی کشش آنے سے، پھر بھی
ہم سخت گنہ گار ترے در پہ کھڑے ہیں

آئے ہیں تو رحمت کی عطا لے کے ٹلیں گے
کس نے کہا بے کار ترے در پہ کھڑے ہیں

رُخ کر کے جو سوتے تھے مدینے کی طرف ہم
لے کر وہی رُخسار ترے در پہ کھڑے ہیں

روضہ ترا انوار کا ہے محور و مرکز
لینے وہی انوار ترے در پہ کھڑے ہیں

محمد افضال انجم

نعتؐ

کاغذ پہ جو پڑی ہے قرینے سے روشنی
لگتا ہے آ رہی ہے مدینے سے روشنی

میلادِ پاک ہم نے منایا تھا! گاؤں میں
پھیلی ہوئی ہے پورے مہینے سے روشنی

خالق نے اِس سے خلق کیے سارے انبیاء
پھوٹی ہے جو نبی کے پسینے سے روشنی

صلِّ علیٰ کا ورد ابھی تھا زبان پر
بسم اللہ پڑھ کے نکلی دفینے سے روشنی

مَس کر کے آ رہا ہوں میں یثرب کی خاک سے
کیسے نہ اب نکلتی نگینے سے روشنی

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تُو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیت لکھی

عقیدت

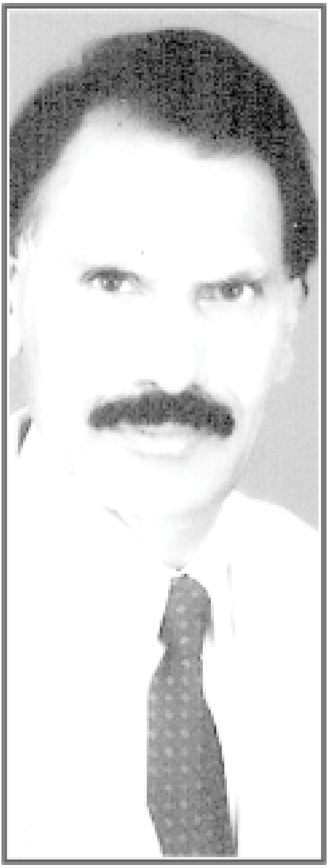

رہوں گا در سے میں دور کب تک، حضور کب تک
رہوں گا یوں غم سے چور کب تک، حضور کب تک

دکھا دیں روضہ حضور مجھکو، ضرور مجھکو
رہے گا دل ناصبور کب تک، حضور کب تک

حریص ہوں میں شفاعتوں کا، عنایتوں کا
یہ ہو گا یومِ نشور کب تک، حضور کب تک

خزاں رسیدہ ہیں آرزوئیں، یہ جستجوئیں
کہ آئے گا ان پہ نُور کب تک، حضور کب تک

نگاہیں طیبہ کو ڈھونڈتی ہیں، مچل رہی ہیں
ملے گا جلوؤں کا طور کب تک، حضور کب تک

پلا دیں؟ اپنے عشق کی اب، ملے گی یہ کب
ملے گا اس کا سرور کب تک، حضور کب تک

احمد جلیل

---------- انتخاب ----------

- خالد احمد -

-------- نعمان منظور --------

مدح لکھوں میں کس کی خالد، کس کی حمد کروں
رحمت دو عالم ہیں، رحمت کل کے آئینہ دار

عقیدت

بہ فیضِ صلِّ علیٰ تیغِ شاد کام کے حرف
ہیں نعت عشق و ادب میں ہر اہتمام کے حرف

ہے نعت اُن کا کرم ورنہ جانتا تھا نہ میں
ہیں کیسے؟ اس ذرتِ حق سے التزام کے حرف

فقط نمودِ چراغاں سے ہے کہیں اچھا
لکھیں مسرّت میلاد پہ صیام کے حرف

ضمیر جب نہیں روشن فریب ہے یہ اُمید
کہ رنگ لائیں گے دیوار و در کے، صیام کے حرف

حق اُن کی نعت کا ہوگا نہیں ادا ہم سے
کہ ہم ہیں مل کے بھی سب صوت ناتمام کے حرف

تسلی آپ کے در پہ وہ بن گئے دل کی
خواص سنتے نہیں اب بھی جو عوام کے حرف

ہے راز و رمزِ ازل ان میں کیا وہ یہ جانیں
میں مقتدی مرا قرآں ہیں بس امام کے حرف

لگاؤں سینے سے ہر ذرہ خاکِ طیبہ کا
ہوں نقش دِل پہ کفِ پائے خوش خرام کے حرف

اُنھی کے دم سے ہے اقلیمِ دیں کہ ان کے بغیر
نہ انتظام کا دفتر نہ انصرام کے حرف

قریبِ جاں بھی ہے خاموش بھی وہ، بولے جب
تو لے کے بولتا ہے سیّدُ الانعام کے حرف

بشر سے ہم اُنھیں بس نور کہہ سکے، آگے
ہیں رب کے علم میں ہر شان ہر مقام کے حرف

وہ غلبہ دیکھے گی پھر دیں کا مسجدِ اقصیٰ
ہیں جس کا مژدہ من المسجد الحرام کے حرف

ہے لکھنا صلِ علیٰیں سے وہ عہد بھی، آصف
بشر پہ ناز کریں خلقِ نور فام کے حرف

مرزا آصف رسول

رباعیات

دل ریزۂ اشک غم میں بویا نہ کرے
ہر دیدۂ اسرار کو گویا نہ کرے
جس خواب سے جاگتا ہے قوموں کا ضمیر
تقدیر اگر دیکھے تو سویا نہ کرے

....

نامرد انا بچھونا بن جاتی ہے
قسمت کی لکیر سونا بن جاتی ہے
افلاس آرزو میں رکھو نہ اسے
ورنہ عورت کھلونا بن جاتی ہے

....

افلاس کی دھوپ ہر کوئی سہتا نہیں
چھاؤں کا سماں ایک طرف بہتا نہیں
دولت رہتی نہیں سدا پاس میاں
دولت رہ جائے آدمی رہتا نہیں

....

سچ میں یہاں جھوٹ کی رضا ہوتی ہے
قانون کی جرم پہ قبا ہوتی ہے
انصاف کو مظلوم بنا دیتے ہیں
ہر ظلم عدالت کی خطا ہوتی ہے

....

توفیق کی بھوک میں کرم رہتا ہے
تقدیر میں خوشیوں کا ستم رہتا ہے
میں حسن کا معشوق مرا عشق مرید
افسوس سے باہر مرا غم رہتا ہے

....

حیرانی سے دریچے تھک جاتے ہیں
دروازے دیکھ کر بہک جاتے ہیں
زلفیں لہرایئے نہ یوں بام پہ آپ
منزل سے راستے بھٹک جاتے ہیں

....

بے باک گرہ بندِ قبا میں پڑی ہے
شوخی بھی شرارت بھی حیا میں پڑی ہے
ہے پھول میں وہ عکسِ بدن کی خوشبو
کیا صورت ہے کہ التوا میں پڑی ہے

محمد نصیر زندہ

رباعیات

ٹھہرے ہوئے لہجے سے انا گزری ہے
خورشید کے سائے میں گھٹا گزری ہے
بہنے لگا پانی بھی سرابوں کے بیچ
اس بار خموشی سے ہوا گزری ہے

....

خورشید کے قدموں میں گھٹا ہے تو ہے
اب وقت کے ہاتھوں میں شفا ہے تو ہے
رکتا ہے اگر سانس تو رک جانے دو
جب اس نے کہا آج ہوا ہے تو ہے

....

بپھرا ہوا طوفان ہے آدھے دن سے
شاید کوئی مہمان ہے آدھے دن سے
بے چین بہت آنکھ کی پتلی اب ہے
رستہ بھی پریشان ہے آدھے دن سے

....

گو دکھنے میں اوباش ہیں ہم عشق نصیب
ہر حال میں خوش باش ہیں ہم عشق نصیب
چاہے تو اٹھا لے جسے چاہے پھینکے
اُس ہاتھ میں بس تاش ہیں ہم عشق نصیب

....

آنگن میں ہوا دیکھ کے پل بھر سوچو
جسموں میں خلا دیکھ کے پل بھر سوچو
گلیوں میں صدا گونجتی ہے صحرا کی
ہاتھوں میں دعا دیکھ کے پل بھر سوچو

....

ہاتھ کو اٹھا کر اپنی حفاظت کے لیے
کرنی ہے دعا اپنی حفاظت کے لیے
ہر سمت یہاں پھیلے ہیں اللہ والے
اللہ کو بلا اپنی حفاظت کے لیے

....

اس جا سے اٹھا آج زیادہ پی کر
رستے میں گرا آج زیادہ پی کر
ہر ایک ملا مجھ سے بڑی شدت سے
خود سے بھی ملا آج زیادہ پی کر

....

انسان کی ہستی کی حقیقت کیا ہے
خشکی پر مچھلی کی حقیقت کیا ہے
بن جاتا ہے لقمہ سگِ آوارہ کا
بیٹھے ہوئے پنچھی کی حقیقت کیا ہے

سعید اشعر

ماہیے

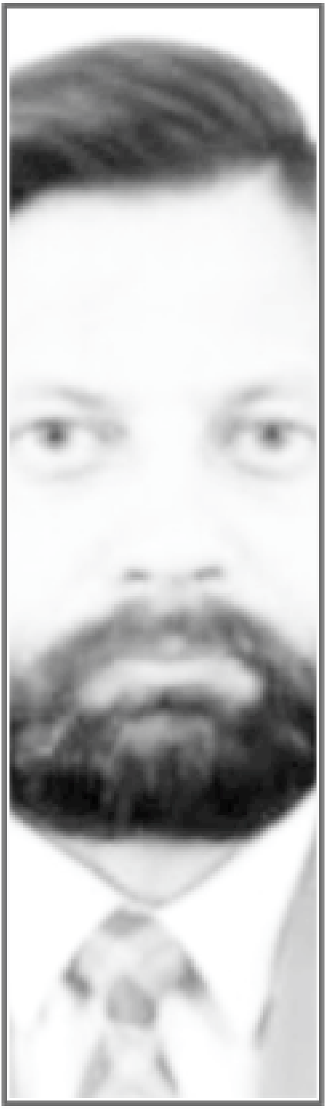

خاور اعجاز

آسودۂ جاں ہوں گے
جب تک تُو آئے
ہم لوگ کہاں ہوں گے

کب تیری عنایت ہے
دل زخمی کرنا
دُنیا کی روایت ہے

ہر بات بنا لے گا
اُس کا زمانہ ہے
جو رنگ جما لے گا

اِک بات بتا گوری
تیرے خوابوں کی
کس ہاتھ میں ہے ڈوری

پانی کا کٹورا ہے
کہتی ہیں سکھیاں
لڑکا تو چٹورا ہے

دوہے

دو لفظوں کے جھوٹ نے، الٹی کر دی جیب
اچھی صورت ایک دم، دیکھی پھر بد زیب

....

اب تک دیکھی کون سی، جیون میں تقریب
عشق کے ہاتھوں درد کی، بدل گئی ترکیب

....

میں نے اس کو دی بہت، آنے کی ترغیب
میرے حصے میں رہی، فرقت کی تادیب

....

سب نے دیکھی بزم میں، آنکھوں کی تخریب
ہم سے کوئی پوچھتا، پینے کی تہذیب

....

اسے سمجھنے کے لیے سوچیں گے ترکیب
ہو جاتی ے دھوپ میں، بارش کی ترتیب

....

اس کے آنگن بیٹھ کے، ہویا میں مرعوب
پتا پتا خاص تھا، پیڑوں کا اسلوب

....

تیری گلی میں دے رہا، مدت سے جاروب
کس جانب سے آیا تھا، جانے یہ مجذوب

....

جتنی باتیں ساجنا، تجھ سے ہیں منسوب
ساری باتیں آج تک، مجھ کو ہیں مرغوب

....

پی کر تیرے ہاتھ سے، تھوڑا سا مشروب
ساری دنیا چھوڑ کے، اپنا بنا مطلوب

....

کر کے اسے مغلوب میں، اشعر ہوا مصلوب
سن کر میرے داستاں رونے لگے یعقوب

سعید اشعر

اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے

میری بہن جمیلہ ان دنوں بہت ہی بیمار تھی.... میں نے وقت نکالا امریکہ سے پاکستان آ گئی اور سیدھی آپا جمیلہ کے گھر چلی گئی۔ جب دیکھا تو اس کے چہرے پر بے سکونی کی شکنیں نظر آ رہی تھی....وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرانے لگی۔ سوکھے ہونٹ یوں کھلے جیسے پھولوں کو پانی دو تو وہ ہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بے انتہا خوش ہو رہی تھی جانتی ہو میں تمھیں کتنا یاد کر رہی تھی۔

"آؤ عائشہ" اس نے مجھے پکارا۔

میرے پاس بیٹھو....اور میری دکھ بھری کہانی سنو....جیسا کہ تم جانتی تھی کہ میں نے نہایت ہی غربت میں اپنے بچے پالے....اور کافی سال اپنی شادی کو قائم رکھا.....اور پھر شوہر دوسری دنیا میں چلا گیا...تو میں نے اولاد کے لیے کیا کچھ نہیں کیا نہ صرف پڑھایا بل کہ اعلیٰ تعلیم دلوائی اور لڑکے .... آہستہ آہستہ....شادیوں کے بعد مجھ سے علیحدہ ہو گئے....اور میں تنہا رہ گئی...تم تو جانتی ہو....کہ شوہر کے پاس نوکری کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہ تو والدین تھے جو حیات تھے انھوں نے میری بھرپور مدد کی....اور تینوں کو اعلیٰ ڈگریاں دلوائیں۔ مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ یہ علیحدہ ہو جائیں گے۔ دو اسی شہر اپنی بیویوں کے ساتھ رہتے ہیں اور باقی جو ایک ہے وہ دوسرے شہر میں بیوی کے ساتھ امن کی زندگی گزار رہا ہے......میں اکیلی رہ گئی تھی۔

"تو کیا آپ کو ملنے نہیں آتے؟"

"آتے ہیں....مگر صرف ایک گھنٹہ ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میں نے اچھے اچھے گھرانوں میں ان کی شادیاں کیں۔ مگر وہ نہ صرف بیوی کا کہا مانتے ہیں بل کہ اپنے سسرال والوں کا دم بھرتے ہیں"۔

جب چھوٹا بیٹا اپنی پوسٹ پر اسلام آباد چلا گیا تو جاتے جاتے کہہ گیا۔

میں ہر مہینے آؤں گا اور جب آپ کا جی چاہے آپ بھی میرے گھر آ سکتی ہیں۔ اس وقت میں صحت یاب تھی اور اپنے گھر میں مجھے سکون بھی تھا...مگر تنہائی بڑی ظالم ہے میں ان کو یاد کر کر کے بیمار ہو گئی ہوں....تمھارا کس طرح شکریہ ادا کروں میں نے بلایا اور تم باہر کے ملک سے آ گئی ہو....دل کی بیماری کے علاوہ مجھے گھٹنوں کی بھی تکلیف ہے....ٹھیک سے چل پھر نہیں

بلقیس ریاض

سکتی.... میں نے مجبور ہو کر سوچا کہ باری باری.... سب کے گھروں میں چلی جایا کروں گی.... دل بھی بہل جائے گا اور بچوں سے بھی مل لیا کروں گی۔ جو لاہور میں رہتے ہیں وہ تو کبھی کبھی ویکنڈ پر آن کر مجھے باہر ایک گھنٹے کے لیے لے جاتے ہیں اور واپس پھر مجھے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر ایک دو دن کے لیے ان کے گھر رہنا پڑے تو بہوؤں کے موڈ آف ہو جاتے ہیں۔ عائشہ.... اس طرح ان کے موڈ دیکھ کر جانتی ہو میرا کیا حال ہوتا ہے۔ کل بہو اور چھوٹا بیٹا آیا تھا.... میں نے کہا.... کہ تم نے جب نیا گھر بنایا تھا اور کہا تھا کہ ایک کمرہ آپ کے لیے بنایا ہے آپ یہاں کی فضا سے لطف اندوز ہوں گی.... پہاڑوں کے دامن میں بنایا ہے.... اور ابھی تک بند ہے.... اور وہ بچوں کے ساتھ کرایہ کے گھر رہتا ہے۔ میں نے اسے کہا مجھے وہاں ہی لے جاؤ تو بہو اور بیٹا دونوں ایک دم پریشان ہو گئے.... جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو.... کہنے لگا سیڑھیوں کا گھر ہے.... آپ کا گھٹنہ ٹھیک نہیں ہے.... اسلئے.... میں یہاں ہی آپ کا علاج کروا دوں گا۔ وہاں اوپر جانا مشکل ہوگا۔ دونوں صاف انکار کر کے چلے گئے ہیں.... جمیلہ نے دکھ بھرے لہجے میں سب کچھ بتا دیا اور بہو کے میکے والے اسی شہر میں رہتے ہیں.... اور بیٹا بیوی کے ساتھ سسرال میں ہی رات گزارتا ہے اور دوسرے دن چلا جاتا ہے۔ عائشہ وہ زار و قطار رونے لگی..... جیسے آنسو کا سیلاب بند باندھے کھڑا تھا.... راستے بناتا ہوا اس کے چہرے کو تر کر گیا موٹے موٹے آنسو.... گالوں پر پھسل رہے تھے.... اور میں نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔

فکر نہ کریں جب نئے گھر میں جائے گا تو آپ کو ساتھ لے جائے گا۔

ساتھ.... وہ میرے گلے سے لپٹتے ہوئے بولیں۔

گھر کو تالا لگایا ہوا ہے۔ بہو میرے مرنے کا انتظار کر رہی ہے.... وہاں جا کر شفٹ ہو گی۔ اسی طرح یہاں اسی شہر میں دو بہوئیں بھی ایسی ہیں۔ بل کہ اسی انتظار میں ہیں کہ کب میں مروں اور یہ تینوں گھر بیچ کر اپنا اپنا حصہ لے لیں۔ عائشہ.... مکافات عمل ہے.... ان لڑکیوں کے والدین اچھے نہیں ہیں.... ان تینوں کو گمراہ کر دیا ہے.... میں نے تو زیادہ جینا نہیں.... میں شوہر کے پاس جانے والی ہوں.... تم میرے بعد ان کا حال دیکھنا.... وہ ابھی تک میرے حصار میں عافیت محسوس کر رہی تھی۔ کچھ ہی روز کے بعد وہ زندہ نہ رہی اور اس کا انتقال ہو گیا.... اور چہلم تک مجھے رکنا پڑا.... تینوں نے مکان بیچ کر اپنا اپنا حصہ لے لیا.... کئی روز تک میں.... اس کے جانے کے بعد اشک بار رہی۔

چہلم کے بعد.... میں امریکہ نہیں گئی تھی کیونکہ میں نے ضروری کام سے اسلام آباد جانا تھا.... بھانجوں کو معلوم تھا کہ میں یہاں ہی ہوں۔ جس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی وہاں مجھے میرے چھوٹے بھانجے کا فون آیا.... فرید نے کہا۔

”خالہ جان میں نے سنا ہے آپ آجکل اسلام آباد میں ہیں“.

”ہاں میں.... ایک ضروری تقریب میں شمولیت کے لیے آئی ہوں“۔ یہ تو بہت

اچھا ہے.... بڑی خوشی ہو رہی ہے.... ماں تو چلی گئی ہے مگر خالہ جان آپ ماں کی جگہ ہیں آپ نے ضرور آنا ہے۔

''کوئی تقریب ہے کیا؟''

''جی... ہاؤس وارمنگ پارٹی ہے.... ہو تو پہلے جاتی تھی مگر امی کا چہلم تھا۔ کل ہمارے گھر آپ نے ضرور آنا ہے... گھر کا پتہ میں نے لکھ دیا ہے.... آپ ضرور آئیے گا''.

فون بند ہو گیا.... میری آنکھوں میں آنسو اتر آئے... اور بے حد غم زدہ ہو گئی اپنے دل کو سنبھالا... اور دوسرے دن.... نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہوئی اور فرید کے گھر روانہ ہو گئی۔

ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی۔ اسلام آباد.... اس وقت سبزے کی وجہ سے نکھرا نکھرا تھا۔ ایسے علاقے میں گھر تھا جیسے چار سو بڑے بڑے پہاڑ کھڑے تھے اور جا بجا درخت ہوا کے ہلکوروں سے جھوم رہے تھے۔ فضا بڑی رنگین پرور تھی... صاف شفاف خال خال گھر دکھائی دے رہے تھے۔

پھولوں کے پودوں سے ساری فضا معطر تھی... گھر کے آس پاس لوگوں کی گاڑیاں پارک ہوئی تھیں.... بڑے لان سے گزرنے لگی... تو چنار کے درخت باغ کے کونے میں کھڑے تھے... اتنے پھولوں کے پودے رنگ رنگ کے جن کا شمار نہیں تھا۔

لان کا سبزہ اتنا سبز کہ یوں لگتا تھا جیسے سبز قالین بچھا ہو۔ سنگ مرمر کے بینچ اور بہتی آبشار کیا کچھ دیکھنے کو نہیں مل رہا تھا۔ باغ کے دوسرے کنارے سوئمنگ پول تھا....

آسمان پر بادل چھائے تھے.... موسم بڑا ہی دلفریب تھا... صدر دروازے پر پہنچی تو فرید اور اس کی بیوی نے خیر مقدم کیا.... مہمان گرامی.... ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے محو گفتگو تھے.... میں ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں بیٹھ گئی.... جہاں چھت پر بڑے بڑے شینڈلر اپنی روشنیاں بکھیر رہے تھے.... کچھ مہمان آچکے تھے اور دھیرے دھیرے باقی لوگ بھی آنے شروع ہو گئے۔

یہ بنگلہ ایک پہاڑی کے اوپر تعمیر ہوا تھا۔ پہاڑی کی ڈھلوان سے ایک پگڈنڈی نیچے ندی کی طرف جاتی تھی۔ باہر ہواؤں میں رسیلی نرمی آچکی تھی۔ بڑی بڑی شیشوں کی کھڑکیوں سے باہر باغ کے درخت ہلکی ہلکی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ فرید کی اہلیہ امبرین مہمانوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آ رہی تھی۔ لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ فرید کے بڑے بھائی بمعہ بچوں کے وہاں موجود تھے۔ ایک سہیلی نے امبرین کو کہا۔

اتنا خوب صورت گھر یوں لگتا ہے خوابوں کا محل ہو ایک سال سے بند کیوں پڑا تھا۔

تم پہلے کیوں نہیں آئی؟

وہ مسکرائی۔

بس وقت بھی مناسب تھا۔ کچھ رینوویشن کی ضرورت تھی۔

وہ بولی۔

کاش تمہاری ساس زندہ ہوتی تو بیٹے کا گھر دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔

کیوں نہیں.... بیچاری بیمار تھیں۔ سفر کرنے

کے قابل نہیں تھیں.... ورنہ ضرور آتیں۔
کھانے کے لیے بلاوہ جب آیا تو سب نے کہا ہم تو پورا گھر دیکھ کر کھانا کھائیں گے۔
امبرین نے جواب دیا۔
"پہلے کھانا... تمام مہمان گرامی.... باہر سوئمنگ پول کھلے ایریا میں کیٹرنگ کا بندوبست تھا... ہر قسم کے کھانے تھے۔ کوئی ایسی ڈش نہیں تھی جو اس کھانے میں شامل نہ ہو۔"
میٹھی میٹھی باتوں سے سب خوش باش دکھائی دے رہے تھے.... یہ ایسا گھر تھا کہ اوپر کے فلور پر جانے کے لیے لفٹ لگی ہوئی تھی۔
کھانے کے اختتام پر سب لوگ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچے.... نیچے کا فلور تو دیکھ چکے تھے اوپر ٹیریس سے چاروں طرف ویو دیکھنے والا تھا... آسمان پر ابھی بھی بادل چھائے تھے.... کبھی کبھار ہلکی ہلکی بوندیں بھی برسنے لگتیں.... نیچے آنے کے لیے لفٹ کی طرف مہمان آئے ہی تھے کہ یک دم بجلی چلی گئی اور یو پی ایس کے ذریعے روشنی کی گئی مہمان گرامی سیڑھیاں اترنے لگے۔ امبرین اس وقت بے حد مسرور تھی.... جدید طرز کا لباس اور اسی کے ہم رنگ اونچی ایڑی کا شاندار جوتا جو باہر لندن سے لے کر آئی تھی... مہمانوں کے ساتھ ہنستی مسکراتی.... نیچے اتر رہی تھی.... بے خیالی میں اس کا پاؤں پھسلا اور اوپر کے فلور سے لے کر پوری تیزی سے نیچے تمام سیڑھیوں سے گری.... یکدم شور مچ اٹھا... امبرین کا درد کے مارے برا حال تھا.... مہمان یہ کیفیت دیکھ کر رک نہ سکے..... میرے دونوں بھانجے فرید اور میں اس کو لے کر ہسپتال پہنچے... تو کافی دیر تک اس کا معائنہ ہوتا رہا... پھر آپریشن کرنا پڑا..... آپریشن کے بعد ڈاکٹر اور نرسیں باہر آئیں تو فرید سے کہا۔
سوری... جان تو بچ گئی ہے مگر تین جگہ سے ایک ٹانگ ٹوٹی ہے..... یہ آئندہ زندگی میں چل نہیں سکیں گی۔
ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا... اور فرید کا حال برا تھا .... سب تسلیاں دے رہے تھے.... باہر ابھی بھی گہرے بادل چھائے تھے وہ محل نما گھر سونا پڑا تھا۔ میرا جی چاہنے لگا اپنے اندوہ کی اونچی لہروں میں ڈوب جاؤں میری ساری تکلیفیں ایک قرب میں تحلیل ہو گئیں۔ اپنی بہن جمیلہ کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے... بیوی بہت بری ہے.... مجھے لے جانے کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی بار بار مجھے یہ کہتی رہی کہ آپ کا ایک ٹانگ کا گھٹنا ٹھیک نہیں ہے تو کہتی تھی آپ سیڑھیاں چڑھ نہیں سکیں گی۔ میں بار بار کہتی رہی کہ میں اتنی لاگر نہیں کہ میں سیڑھیاں نہ چڑھ سکوں۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ سکتی ہوں۔ عائشہ گواہ رہنا دنیا میں ہی بدلا مل جاتا ہے.... مکافات عمل ہے... آج میرے ساتھ کیا ہے اور کل اس کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ چل ہی نہ سکے....!!
اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔
میری آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے بھیگ گئے.... میں بھی زیادہ دیر وہاں نہ رہی اور واپس ریسٹ ہاؤس چلی گئی۔

☆☆☆☆☆

ندی اور بوڑھا

باسل فرنینڈو [سری لنکا]
ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

پچھلے دس یا اس سے بھی زیادہ سالوں سے، ہر دن بوڑھا زیادہ تر وقت ندی کے کنارے بیٹھا رہتا۔ اُس کی عمر پیاسی برس تھی اور اب اُس نے کام کاج چھوڑ دیا تھا۔ ندی، بالکل اُس کے گھر کے سامنے تھی اور کچھ صدیاں پُرانی تھی۔

اُس کی ساری زندگی اسی ندی کے قریب گزری تھی یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اُس کی زندگی اسی ندی سے منسلک تھی۔ وہ دھوبی تھا اور یہ سب کچھ اُس کی ہمسائیگی میں تھا۔ سرکاری طور پر، یہ علاقہ جہاں وہ رہتے تھے، ایک گاؤں کا حصہ تھا۔ لیکن اس کو ایک مجموعی احساس نے گھیرا ہوا تھا، بہت عرصے تک، یہ ہمسائے اُن کو ایک ہی گاؤں سمجھتے آئے تھے۔ درحقیقت، لوگوں کے ذہنوں میں سرحدیں کھینچی ہوئی تھیں جن کے نقشے میں کوئی آثار نہیں تھے۔

سمندر کے قریب ایک علاقہ تھا، جو کاراوا مچھیروں سے تعلق رکھتا تھا۔ مچھیرے اور راہدا دھوبی عمومی طور پر دوست تھے۔ مچھیروں کے درمیان جان لیوا لڑائیاں تھیں جن کا اختتام قتل و غارت پر ہی ہوتا تھا۔ ایک خاندان سے ہونے والی موت، دوسرے خاندان میں موت کا سبب بنتی تھی اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ لیکن دھوبی بہت متحد تھے۔ وہ ہمیشہ مچھیروں کی مدد کرتے جب بھی اُن سے بن پڑتا۔ ہر بندہ دھوبیوں کو چھیڑنے سے خوف کھاتا۔ چاہے وہ ایک اکیلا شخص ہی کیوں نہ ہو، وہ کھڑا ہو جاتا اور انتہائی بے رحمی کا مظاہرہ کرتا۔ صرف انہوں نے علاقے کے پہلے سرمایہ دار کا مقابلہ کیا تھا جب اُس نے غریب لوگوں کی زمینیں زبردستی ہڑپ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُن کی مزاحمت نے گوریلا جنگ کی شکل اختیار کر

لی تھی جسے ایک داستان کی طرح بیان کیا جاتا تھا۔

ایسے واقعات کے علاوہ، مچھیرے بہت ہی امن پسند لوگ تھے اور وہ ہمیشہ مضبوطی سے منصفی کے احساس کے ساتھ انصاف کا ترازو تھامے رکھتے۔ وہاں گرجے کے ساتھ، لوگوں کا ایک اور گروہ بھی رہ رہا تھا۔ وہ کاشتکاروں کی نسل سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ لیکن اُن کے نزدیک کسی قسم کے کوئی بھی دھان کے کھیت نہ تھے۔ وہ چند ہی خاندانوں پہ مشتمل تھے لیکن زیادہ زمین کے وہی مالک تھے۔ وہ سارے گاؤں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اُن میں سے کچھ مرد، کولمبو کے کچھ دفاتر میں، کلرک کی نوکری کرتے تھے لیکن دوسرے دیہاتیوں کو وہ ایسا احساس دیتے تھے جیسے کہ وہ شہر میں بڑی بڑی ملازمتوں پہ کام کرتے ہیں۔

درحقیقت، یہ لوگ جو گووی گاما، ایک اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے کیونکہ یہ گاؤں میں، سب سے زیادہ غیر محفوظ لوگ تھے۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو لوگوں کے درمیان زیادہ تر تکلیف کا باعث بنتے تھے۔ گاؤں کے اس مختصر تعارف کا مقصد صرف یہ ہے کہ صرف یہی وہی دُنیا تھی جس کے بارے میں ہمارے بوڑھے کو حقیقت میں پتہ تھا۔

جیسا کہ 1948 میں سری لنکا کو آزادی دی گئی، اُس حساب سے ہم بوڑھے کی عمر اُس وقت اکتالیس برس شمار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اکتالیس برس تک سلطنت برطانیہ کا شہری رہا تھا۔ اُس نے جلد ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس نے جلد شادی کر لی تھی۔ جب اُس کی پہلی بیوی، اپنے پہلے بچے، ایک خوب صورت لڑکی کو جنم دیتے ہوئے فوت ہوئی تو اُس نے اُس کی بہن سے دوسری شادی کر لی۔ آزادی کے وقت، اُس کے آخری بچے کا جنم ہوا تھا۔ کل ملا کر اُس کے سات بچے تھے جن میں سے دو چھوٹی عمر میں ہی وفات پا گئے تھے۔

اس سب کے باوجود، یہ آدمی جو اپنی یادوں کا بے حد شوقین تھا، بمشکل ہی کبھی برطانوی لوگوں یا اُن کی حکومت کے بارے میں بولا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ بیوقوف تھا۔ اگرچہ اُس کی بیشتر تعلیم غیر رسمی سی تھی لیکن اُس کا دماغ بہت تیز تھا۔ وہ اتنی ملائمت سے زندگی کے احساسات کو الفاظ میں ڈھالتا۔ وہ اپنی یادداشت کے اس حصے کو سچ مچ بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کو یاد رکھنا اُس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اُس کے شعور کی گہرائی میں، جہاں وہ محسوس کرتا تھا کہ یہ اُسے بہت گھائل کرتی ہے، وہاں اُس نے برطانوی لوگوں کو دفن کر دیا تھا۔

اُس نے بہت سکون اور غیر یقینی کیفیت

میں، سب کچھ دیکھا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس نے سب کچھ با مقصد اور جان بوجھ کر کیا تھا۔ لیکن یہ بالکل اُسی طرح ہی ہوا تھا جیسے ایک کچھوے کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنا سر اپنے خول میں چُھپا لیتا ہے اور پھر سب کچھ آوازوں سے جانچتا ہے، جسم کے دوسرے حصوں سے اور پھر اپنی آنکھوں کے ساتھ۔ جب سب کچھ ختم ہو جاتا ہے، یہ دوبارہ چلنا شروع کر دیتا ہے جیسے اس نے کوئی خطرہ کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔

ایسی یاداشت میں، صرف وہی شامل نہیں تھا جو براہ راست تجربے سے حاصل ہوا تھا بلکہ اس میں وہ بھی شامل تھا جو پہلے والی نسلوں نے اپنے اُوپر بیتنے والے تجربات سے اُسے بتایا تھا۔ اگر ایسی کوئی چیز ہے، جسے مشترکہ خطرے کی مشترکہ یاداشت کہا جا سکے، بوڑھے آدمی کی نسل کے پاس ایسی ہی یاداشت تھی۔ لیکن وہ بالکل پُرسکون رہتے تھے جیسے کہ اُن کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

بوڑھے نے یہ سب کچھ اپنے بچوں اور پوتوں کو بتایا تھا اور دوسرے بچوں کو بھی، کہ جب وہ جوان تھا تو جنگل میں بے شمار پھل تھے۔ وہ بتایا کرتا کہ وہ جنگل سے کیسے بڑا اور پکا ہوا کٹھل توڑ کر لاتا تھا، وہ جتنا کھا سکتا، کھا لیتا اور باقی بچا ہوا پرندوں کی خوراک کے لیے رکھ چھوڑتا۔

وہ اپنی لکڑی کی کشتی کے بارے میں بھی بتاتا جس میں وہ شام کو مچھلیاں پکڑنے کے لیے دریا پر سفر کیا کرتا اور اس میں اُس کا ایک دوست بھی ہمیشہ ساتھ ہوتا۔ وہ بتاتا کہ وہ کتنی زیادہ مچھلیاں پکڑتے اور کیسے کبھی کبھار تو بہت ہی بڑی مچھلی پکڑی جاتی۔ وہ سبھا چاول اور دال کا بھی بتاتا جو اُن دنوں میں بہت سستا ہوا کرتے تھے۔ وہ امیر لوگوں کے عجیب و غریب مزاحیہ ملبوسات کے بارے میں بھی بات کرتا جو وہ پہنا کرتے اور اس طرح کی اور بہت سی مزاحیہ باتیں جو کہ ریس کورس میں ہوتی تھیں جہاں وہ اور اُس کے کچھ دوست جایا کرتے تھے جب بھی اُن کو موقعہ ملتا۔ جب کبھی بھی اُس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نیا نہ ہوتا تو وہ بار بار ان کو دہراتا، جیسا کہ اُس نے اس ندی میں کئی بار، مہینہ در مہینہ یا سال در سال بہت اُونچی اور بہت ہی نیچی موجزن لہروں کو دیکھا تھا۔

یہ ندی اُس کے لیے امن کی جگہ تھی جبتک کہ اچانک وہاں پہ کچھ نہ ہوا۔ تقریباً ایک ماہ کے قلیل عرصے کے دوران، ندی نے بوڑھے کو بے چین کر کے رکھ دیا اور بالآخر وہ اس سے بدظن سا ہو گیا جیسے یہ کوئی آسیب زدہ جگہ ہو۔ ایک دن، جب وہ ندی کے قریب اپنی جگہ پر گیا تو وہاں پر ایک ہجوم جمع تھا جو ندی کی جانب دیکھ رہا تھا اور باقی لوگ بھی ندی کی جانب آ رہے تھے۔ ندی میں

کسی شخص کی لاش تھی- اگرچہ معمول میں نہیں، لیکن کبھی کبھار یہاں پہ لاشیں تیرتی رہتی تھیں جب کوئی ڈوب جاتا یا کوئی خودکشی کرتا یا جب کبھی کسی کو قتل کیا جاتا- کچھ دیہاتی جلد ہی یہ لاش باہر نکالتے اور پھر پولیس کو اطلاع کرتے اور بس پھر معاملہ ختم ہو جاتا-

لیکن اس واقعے کے بعد، آنے والے کچھ ہفتوں میں، یہ افواہیں گردش کرنی لگیں کہ فوج نوجوانوں کو قتل کر رہی ہے- اب کوئی بھی لاش ندی سے باہر نہ نکالتا- یہ اونچی لہر پہ باہر نکل آتی اور چھوٹی لہر پہ واپس چلی جاتی- بوڑھا اس کو دیکھنے کے لیے ندی کے قریب تک نہ گیا- لیکن کچھوے کے سے انداز میں وہ ہر چیز سے باخبر تھا- وہ گہری نیند سونے والا شخص تھا لیکن اُس دن وہ نہ سو پایا- جب وہ کچھ دیر کے لیے نیند کی وادی میں جاتا تو اُسے ندی میں، اپنے چھوٹے بیٹے کی لاش تیرتی ہوئی نظر آتی اور وہ فوراً نیند سے بیدار ہو جاتا- بار بار یہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ صبح کا سورج نکل آیا اور پھر یقیناً وہ نہ سو سکا جیسے اس وقت سونا بہت ہی شرم کی بات تھی جب صبح کو ایک روشن سورج چمک رہا ہو-

اگلے دن، وہ ندی کے قریب بیٹھنے کے بجائے اپنے گھر کے سامنے بیٹھا- صبح بالکل سکون سے گزر گئی لیکن دوپہر میں، ایک اور لاش وہاں تیرتی ہوئی پائی گئی- اُس رات، وہ ایک تیز چیخ کے ساتھ اُٹھ بیٹھا- وہ اس خواب کو واضح طور پر یاد رکھ سکتا تھا جس نے اُسے چیخنے پر مجبور کر دیا تھا- اُس نے یسوع کا ایک بڑا مجسمہ دیکھا، جیسے گڈ فرائی ڈے پیشن سروس کے بعد ایک جگہ لٹایا گیا تھا، اُس نے اُسے ندی میں تیرتے ہوئے دیکھا- وہ اور اُس کا چھوٹا بیٹا دو چوروں کی طرح، یسوع کے مجسمے کے دونوں جانب تھے-

آنے والے ہفتوں میں، وہاں پر بے شمار لاشیں دیکھی گئیں اور دو دفعہ تو ایک ہی دن میں چار سے پانچ افراد کی لاشیں وہاں سے نکالی گئیں- بوڑھے نے ہر ایک کو اپنے خواب میں، ندی میں تیرتے ہوئے دیکھا جنہیں وہ اپنے بچپن سے جانتا تھا، جن سے وہ پیار کرتا تھا- ایک خوفزدگی نے اُس کے چہرے پر اپنا بسیرہ کر لیا تھا- اب وہ کچھ بھی نہیں بولتا تھا- اُس میں ایک پُرانی یادداشت نے جاگنا شروع کر دیا تھا- اُس نے خواب میں کچھ بدیسی لوگوں کو بندوقوں اور تلواروں کے ساتھ دیکھا جو اُس کے گاؤں میں یہ فساد کرا رہے تھے - وہ ننھے منے اور نوزائیدہ بچوں کو قتل کر رہے تھے اور ہر کسی کو اذیت دے رہے تھے-

بوڑھے کو دوبارہ ندی کے قریب کبھی بھی نہ دیکھا گیا-

☆☆☆☆☆

"سچ کا بوجھ"

بارش دیر سے برس رہی تھی۔ نہ وہ تیز تھی کہ کچلی ہوئی مٹی کو کھو ڈالے، نہ اتنی ہلکی کہ نظر انداز کی جا سکے۔ وہ بس موجود تھی۔۔۔ جیسے کوئی پرانا دکھ، جو رکتا نہیں، بہتا بھی نہیں۔ پہاڑی درے کے کنارے کھڑی اس جھونپڑی کے گرد دھند کی چادر لپٹی ہوئی تھی، گویا وقت نے وہاں سانس لینا چھوڑ دیا ہو۔

فادر ایڈورڈ نے چھتری بند کی۔ ان کے بوٹ کیچڑ سے لت پت ہو چکے تھے، اور کوٹ کی آستین پر بارش کی بوندیں تھرک رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک صلیب تھا، جو وہ اکثر نروس ہونے پر مروڑنے لگتے تھے۔ کئی مہینوں سے وہ اس جھونپڑی کے بارے میں سن رہے تھے۔۔۔ لوگ اسے "ولی کا حجرہ" کہتے تھے۔

لیکن ولی کوئی عالم نہیں تھا، نہ ہی کسی مسلک کا داعی۔ وہ شخص تھا، جس نے چپ رہ کر لوگوں کو اپنے اندر جھانکنے دیا تھا۔ اور یہی بات ایڈورڈ کو سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی۔ وہ لوگ جو خدا کے خادم کہلاتے تھے، وہ زبان سے دلیلیں دیتے تھے، اور یہاں ایک شخص بغیر زبان کے بات کرتا تھا، اور لوگ اس پر یقین کر لیتے تھے۔

دروازے پر دستک دی گئی۔

کچھ لمحے بعد دروازہ چرچراتے ہوئے کھلا۔ ایک نحیف، سفید داڑھی والا بوڑھا نمودار ہوا۔ چہرے پر عمر کا غبار تھا، لیکن آنکھوں میں کسی ایسے شخص کا سکون، جو کسی عظیم بھید تک رسائی پا چکا ہو اور اب بولنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا ہو۔

"آپ ولی ہیں؟" ایڈورڈ کی آواز کسی حد تک لرز رہی تھی۔

"اگر تمہارے سوال میں سچ ہے، تو ہاں۔ اگر شک ہے، تو نہیں،" بوڑھے نے مسکرا کر کہا اور دروازہ کھول دیا۔

اندر کا کمرہ مختصر تھا۔ ایک چٹائی، ایک پرانا چراغ، مٹی کا کٹورا، اور دیوار پر ایک آئینہ۔ وہ آئینہ عجیب تھا۔۔۔ اس میں عکس آتا تو تھا، لیکن جیسے وقت کی گرد اس میں سے جھانکتی ہو۔ ایک کونے میں لکڑی کی صلیب رکھی تھی۔۔۔ لیکن اس پر المسیح نہیں، بل کہ ایک کھلا ہاتھ بنا تھا، جیسے کوئی دعا میں ہو یا کسی کو روک رہا ہو۔

"بیٹھو،" ولی نے کہا، "تم دور سے آئے ہو۔"

ایڈورڈ بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے۔ باہر بارش کی ٹپ ٹپ اب اندر کے سکوت کا حصہ بن چکی تھی۔

شاہ روم خان ولی

"لوگ کہتے ہیں، آپ کو خدا سے کوئی خاص نسبت ہے۔"

"نہیں۔ بس میں نے اُس کی آواز سننا بند نہیں کی۔"

"آواز؟ کیسی آواز؟" ایڈورڈ نے کچھ تلخی سے پوچھا۔

ولی نے چراغ کی لو کی طرف دیکھا، جو بار بار لرز رہی تھی۔

"وہ جو تمھارے اندر سے آتی ہے، اور تم اُسے اکثر 'ضمیر' کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہو۔"

ایڈورڈ خاموش ہو گیا۔

"میں ایک پادری ہوں۔ عمر عبادت میں گزری۔ لیکن کئی بار لگتا ہے جیسے میرا ایمان، خوف کا لباس پہنے کھڑا ہے۔ میں خدا سے محبت نہیں کرتا۔۔۔ میں اُس سے ڈرتا ہوں۔"

ولی نے آہستہ کہا، "یہی پہلا دروازہ ہے۔ جو سچ خود کے بارے میں جان لیتا ہے، وہ خدا سے جھوٹ نہیں بولتا۔"

"لیکن کیا خدا صرف محبت ہے؟ کیا وہ سزا نہیں دیتا؟"

"محبت خود ایک سزا ہے۔" ولی نے آہستہ سے کہا، "جب تم سچ سے محبت کرو، وہ تمھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے، تاکہ تم دوبارہ جڑ سکو۔۔۔ ایک بہتر سچ میں۔"

ایک طویل خامشی کے بعد ایڈورڈ نے دوبارہ سوال کیا، "کیا آپ نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟"

ولی نے آہستگی سے سر ہلایا۔

"نہیں۔ لیکن میں نے اُس کو غیر موجود ہوتے دیکھا ہے۔"

ایڈورڈ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جب لوگ ایک دوسرے کو دیکھنا چھوڑ دیتے ہیں، جب آنکھیں صرف چہرے پہ رُک جاتی ہیں اور دل پہ نہیں، جب خامشی خوف بن جائے اور شور عبادت ----- تو سمجھو خدا وہاں نہیں۔"

ایڈورڈ کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

"اور اگر وہ واقعی نہ ہو؟ اگر ہم سب بس خود کو دلاسے دے رہے ہوں؟"

ولی نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھا، چراغ کو دوبارہ تیل سے بھرا، اور اُس کی لو کو مضبوط کیا۔ پھر مڑ کر بولا!!!!

"فرض کرو خدا نہیں ہے۔ پھر بھی، سچ، محبت، اور رحم کا بوجھ کون اٹھائے گا؟ اگر تم اسے خود نہیں بن سکتے، تو تمھیں اسے ماننا ہی ہوگا۔۔۔ چاہے وہ ہو یا نہ ہو۔"

جب ایڈورڈ جھونپڑی سے باہر نکلا تو بارش رک چکی تھی، لیکن فضا میں کچھ باقی تھا۔ جیسے بارش کے بعد بھیگی مٹی میں وہ بھید رچ بس گیا ہو، جو زبان سے نہیں، صرف خاموش قدموں سے سمجھا جا سکتا تھا۔

انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

ولی تھا یا نہیں؟ یہ سوال اب اہم نہیں رہا تھا۔ کیونکہ اُس کی باتوں نے ان کے اندر کوئی دروازہ کھول دیا تھا۔۔۔ اور شاید یہی معجزہ تھا۔

☆☆☆☆☆

بند کھڑکیاں

شاہد صاحب ساٹھ برس کے ایک سنجیدہ طبیعت کے انسان تھے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ استاد تھے۔ پینتیس برس انھوں نے نجانے کتنی نسلوں کو علم کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔ ان کے لگائے ہوئے ہزاروں پودے اب تناور درخت بن کر ملک وقوم کی خدمت میں سرگرداں تھے۔ انھوں نے اپنے طلباء کی نا صرف علمی پیاس بااخلاق انداز میں بجھائی بل کہ تعلیم وتربیت پر بھی خاص توجہ دی۔ ان کی بیوی عرصہ ہوا تھا، اس جہانِ فانی سے جنتوں کی سیر کو کوچ کر گئیں تھی۔ وہ سچ میں ان کی رفیقۂ حیات تھیں۔ جب تک وہ زندہ رہیں، شاہد صاحب کو تنہائی نے کبھی بھی چھو کے نہیں لگائے۔ ادھر انھوں نے اپنی سروس پوری کی ادھر وہ چل دیں۔ انھیں اپنی بیوی کی بے حد کمی محسوس ہوتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ وہ صاحب اولاد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تین، تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ تینوں بیٹے پڑھے لکھے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ شادی شدہ تھے۔ بیوی، بچے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ بس شاہد صاحب کو تنہائی کا قلق لیے جاتا تھا۔ بھرا پڑا خاندان ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی تنہا ہی جی رہے تھے۔ وہ اس وقت آرام کرسی پر بیٹھ جمائے اپنے گزرے دنوں کی سنہری یادوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ تصور میں اپنی بیوی اور پہلے بچے کی قلقاریوں کو دیکھ رہے تھے کہ ان کی گود میں پڑے موبائل فون کی بیل بجنا شروع ہو گئی۔ وہ چونک اٹھے۔ انھوں نے موبائل فون اٹھا کر کال ریسیو کر لی۔

”ڈیڈی! میں نے آپ کے اکاؤنٹ میں پیسے ٹرانسفر کر دیے ہیں۔ جی بھر کھایا، پیا کریں۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کریں۔“ دوسری طرف ان کا بیٹا تھا۔

”ارے! میں اکیلی جان کتنا کھا لوں۔ صحت میری ٹھیک ہونے کی دوا تم اور بچے ہو۔ کبھی مجھے یہ دوا ہی دے جاؤ۔“ وہ من میں دبی بات بے اختیار لبوں پہ لے ہی آئے۔

”کیا! ڈیڈی! آپ بچے تھوڑی ہی ہیں۔ آپ بھی تو سرکاری ملازم ہی ریٹائر ہوئے ہیں۔ آپ کو تو سب پتا ہے۔ نوکری کے چکر میں شہر بدلی، بچوں کا سکول سب دیکھنا پڑتا

بابر امین ابر

ہے۔ اب روز روز تو نہیں آ سکتے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد بچوں کو لے کر آپ کے پاس آؤں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"
بیٹے نے ان کی بات سن کر چند لمحاتی توقف کے بعد کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ شاہد صاحب کی آنکھیں بے اختیار ڈبڈبا گئیں۔ یہ تو غنیمت تھی کہ یہ بیٹا پھر بھی پوچھ لیتا تھا۔ دوسرے تو مہینوں ان کی خبر نہ لیتے تھے۔
ابھی وہ اسی غم میں تھے کہ ان کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ وہ اٹھے اور انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ان کا کسی زمانے کا شاگرد عادل کھڑا تھا۔
"سر جی! وہ اپنا وائی فائی کا پاسورڈ تو دیجیے گا۔ ابو کی بیرونِ ملک سے کال آ رہی ہے۔ ہمارا نیٹ سلو چل رہا ہے۔" عادل نے سلام کر کے تیز تیز لہجے میں کہا۔ شاہد صاحب کو وہ وقت یاد آ گیا جب عادل ان کے گھر کے باہر ٹیوشن پڑھنے کے لیے ان کی سکول سے آمد کا منتظر ہوا کرتا تھا۔
"ارے! عادل میاں! کبھی کبھار خیریت بھی دریافت کرنے آ جایا کرو۔ یا بس وائی فائی کا پاسورڈ ہی لینے کے لیے آتے ہو؟" شاہد صاحب نے اسے پاسورڈ بتاتے ہوئے کہا۔
"بس سر جی! آپ کو تو پتا ہی ہے زمانہ کیا حالات ہیں۔ وقت کسی تیز گام کی مانند سب کو پیچھے دھکیل رہا ہے۔ اس سے مطابقت رکھنے کے لیے گیہوں کی طرح میں پس رہا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں کسی دن آتا ہوں۔ پھر جی بھر باتیں کریں گے۔ میں آپ سے شرمسار ہوں۔" عادل نے قدرے ندامت بھرے انداز میں کہا۔ وہ چل دیا۔ شاہد صاحب اس کی پشت دیکھتے رہ گئے۔
"یہ بات نہیں ہے کہ وقت تیز رفتار ہو چکا ہے۔ ہم ہی وقت سے آگے نکلنے میں مصروف ہیں۔ ہم نے اس گلی کی تمام کھڑکیوں کی طرح دل بھی بند کر لیے ہیں۔ عادل بیٹا! تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔" شاہد صاحب جلے دل کا پھپھولا پھوڑ بیٹھے۔
آج جنازہ گاہ بھری ہوئی تھی۔ سب میت کے انتظار میں تھے۔ شاہد صاحب کی طرح ہی ایک بیوہ خاتون دوسری گلی میں رہتی تھی۔ اس کے بچے بیرونِ ملک مقیم تھے۔ اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں شاہد صاحب کا جیسے دل چیر رہی تھیں۔
"یار! پتا نہیں! کیا مصیبت ہے! لوگ وقت کی پابندی کا بالکل بھی خیال نہیں رکھتے۔ ابھی تک میت لے کر نہیں پہنچے ہیں۔ اگر جنازہ دیر سے ہی پڑھنا تھا تو ہمیں بھی اطلاع دے دیتے۔ ہم بھی وقت پر آ جاتے۔ خوار نہ ہوتے۔ اوپر سے یہ گرمی بھی شاید آج ہی پڑنی ہے۔" ایک آواز جیسے شاہد صاحب کے دل میں چبھ سی گئی۔
"ہاں! میں بھی دفتر کا کام چھوڑ کر آیا تھا۔

اب نجانے کتنا وقت لگ جائے گا۔ دفتر سے جھاڑ الگ سننا پڑے گی۔" دوسری آواز میں بے زاری واشگاف انداز میں عیاں تھی۔

"بھئی! ہم تو فارغ بیٹھے ہوئے تھے۔ مرحومہ ساتھ ہماری پڑوسن بھی تھی۔ اس لیے ہم تو بھئی وقت نکال لئے اور خانہ پُری کو چلے آئے ہیں۔" یہ ایک بوڑھی آواز تھی لیکن انداز میں مروت کا شائبہ تک نہیں تھا۔

درخت کے نیچے بیٹھے شاہد صاحب کی آنکھوں میں یہ باتیں سن کر نمی تیر گئی۔ ان کے دماغ میں خیال ابھرا، واقعی لوگ اب صرف کھڑکیاں ہی بند نہیں کرتے ہیں بل کہ اب دل بھی بند کرتے جا رہے ہیں۔

بعد از نماز جنازہ، شاہد صاحب نے اپنے گھر کے اردگرد ہمسایوں کو شام میں دعوت چائے دے دی۔ وہ پکا تہیہ کر چکے تھے کہ وہ دلوں کی بند کھڑکیاں کھول کر رہیں گے۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے کن الفاظ کا چناؤ کروں لیکن پھر بھی کہوں گا کہ مادہ پرستی، بے حسی اور روکھے رویے ہمارے درمیان خلیجیں بناتے جا رہے ہیں۔ ہم ساتھ ساتھ رہ کر بھی اجنبی بن چکے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو ہمارے گلی، محلے زندہ قبرستان بن جائیں گے۔" شاہد صاحب نے کہا۔

"محترم! اب زمانہ بدل گیا ہے۔ وقت پر لگائے اڑا جا رہا ہے۔ ہم اس سے میل نہیں کھائیں گے تو زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا۔" ایک شخص نے کہا۔

"آپ کی بات ٹھیک ہے۔ میں کب انکاری ہوں اس سے۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ انسان کی بھوک نہیں بدل رہی ہے لیکن کیا انسان کو صرف بھوک ہی کی ضرورت ہے، محبت، قربت، رواداری اور آپسی تعلقات کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے؟" شاہد صاحب کا سوال ایک لمحے کے لیے تو سب کو لاجواب کر گیا۔ پھر گفتگو چلتی رہی لیکن لاحاصل موڑ پر ختم ہو گئی۔

شاہد صاحب اس میل ملاقات سے بے حد دلبرداشتہ ہو گئے تھے۔

وہ آج اپنی ڈائری میں لکھ رہے تھے:

"معاشرے نے سونے اور چاندی کو ہی دولت سمجھ لیا ہے۔ لوگ بھول گئے ہیں کہ انسان صدیوں سے محبت اور قربتوں کا بھوکا رہا ہے۔ سب مادہ پرستی کی چکی میں پستے ہوئے اپنے دل کھڑکیوں کی طرح بند کر چکے ہیں۔ میں نے یہ بند کھڑکیاں کھولنے کی بھرپور کوشش کی لیکن............" یہ لکھتے لکھتے شاہد صاحب کے ہاتھوں میں قلم لڑکھڑا گیا اور ان کا سر ڈائری پر ڈھلک گیا۔ ڈائری کے پاس رکھے موبائل فون کی بیل اب بھی بج رہی تھی لیکن شاہد صاحب اب سماعتوں کی حدوں سے گزر چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

گمان کا سفر

اقرا مشتاق

وہ رات بھر پرسکون نیند کے لیے کروٹیں بدلتی رہی- بارہا آنکھیں موندنے کی کوشش کی، مگر ہر بار ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا- جیسے جیسے رات گہری ہوتی گئی، گمانوں کی گرفت بھی سخت ہوتی گئی - ان ہی خیالوں میں ڈوبی تھی کہ آشفتہ چنگیزی کی غزل کی بازگشت نے نیند کو کوسوں دور کر دیا:

وہ ابھی غزل پڑھنے میں محو تھی کہ اچانک ماں کی آواز کانوں پر پڑی ''فروا بیٹا! اُٹھو، صبح کی نماز کا وقت ہو گیا ہے- نماز پڑھ لو، شاباش!''

فروا نے تھکی ہوئی آواز میں کہا، ''جی امی، اُٹھ رہی ہوں-''

فضہ علوی نے بیٹی کو جگانے کے بعد کچن کا رخ کیا اور ناشتہ بنانے میں مصروف ہو گئیں-

نماز فجر کے بعد فروا نے یونیورسٹی کے لیے تیاری کی اور تیار ہو کر کچن میں آ گئی-

جلدی جلدی ناشتہ کرتے ہوئے اُس نے ماں سے اپنے بھائی عابس رضا کی طبیعت کے بارے میں پوچھا-

فضہ نے گہری سانس لی، ''ساری رات درد میں تڑپتا رہا ہے- بیٹا، واپسی پر اس کی دوائیں ضرور لیتی آنا-''

فروا نے چائے کا آخری گھونٹ لیا، ''جی امی، لے آؤں گی- عالیہ کی کتابیں بھی لانی ہیں، پیسے دے دیجیے-''

فضہ نے بیٹی کو دعاؤں میں رخصت کرتے ہوئے کہا، ''آیت الکرسی پڑھ لینا، بیٹا-''

''جی امی، اللہ حافظ-''

یہ کہہ کر وہ رکشے میں سوار ہو گئی، جو بس اسٹاپ تک لے جانے کے لیے ضروری تھا-

فروا ایک خوب صورت، حساس مزاج اور گہری سوچ رکھنے والی لڑکی تھی- وہ ہر چھوٹی بات میں بڑا مفہوم تلاش کرتی-

اس دن اُس نے جامنی رنگ کا گاؤن پہن رکھا تھا اور ہاتھوں پر کالے دستانے-

یونیورسٹی کی بس میں بیٹھتے ہی اُس نے کھڑکی سے جھانک کر سورج کے طلوع ہونے کا منظر دیکھا- ایک وحشت ناک سا گمان دل میں جاگا:

''کہ نہ جانے کون سا دن ہوگا، جب یہی سورج مجھ سے میرے بھائی کو چھین لے گا...''

فروا ہر منظر کو اتنی گہرائی سے محسوس کرتی کہ وہ اُس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا-

اس کے دل میں کئی گمان پنپتے رہتے تھے — غربت، بھائی کی بیماری، اور عزت کی حفاظت کا خوف۔

کھڑکی سے نظر ان لڑکیوں پر پڑی جو اپنے باپ یا بھائی کے ساتھ یونیورسٹی آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ایک لمحے کو اُسے اُن کی خوش نصیبی پر رشک آیا۔

اسی لمحے بس ایک اسٹاپ پر رکی، ایک لڑکی آئی اور اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم!"

فروا نے آہستگی سے جواب دیا اور دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"فروا۔ اور تمھارا؟"

"ماہ جبین۔ میں بھی آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ سے ہوں۔"

فروا چونکی، "اچھا! پھر تو ہم ایک ہی علم کے طالب ہیں"

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور جلد ہی ایک دوستانہ تعلق بن گیا۔

یونیورسٹی پہنچ کر دونوں کلاس کی طرف چل پڑیں، ساتھ بیٹھیں، ہنسیں، اور دن خوشگوار گزرنے لگا۔

کلاسز کے بعد وہ کینٹین گئیں اور فیملی کا تعارف کروایا۔

"میرے ابو، محسن علوی، آرمی میں تھے۔ چار سال پہلے شہید ہو گئے۔ امی فضہ علوی، ایک بھائی عابس رضا اور چھوٹی بہن عالیہ ہے، جو نہم جماعت میں پڑھتی ہے۔"

ماہ جبین نے بھی اپنا تعارف کروایا۔

واپسی پر ماہ جبین گھر چلی گئی، جبکہ فروا اپنی مجبوریاں لیے ایک چھوٹے نجی ہسپتال میں کمپیوٹر آپریٹر کی نوکری پر چلی گئی۔

شام کو جب وہ گھر لوٹی تو سکینہ خالہ پہلے سے بیٹھی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح رشتے کی باتوں سے دل جیتنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"بہن! بیٹی بڑی ہو گئی ہے۔ اب شادی کر دو، کل کس نے دیکھا ہے!"

فروا سلام کر کے سیدھی اندر چلی گئی۔

سب سے پہلے اپنے بھائی کے پاس گئی، اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا، "میرے چاند، کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

عابس نے ہنستے ہوئے کہا، "پہلے سے بہتر ہوں آپی۔"

فروا نے منہ ہاتھ دھویا، کپڑے بدلے اور عالیہ کو پڑھانے بیٹھ گئی۔

ایک دن فضہ نے نرمی سے کہا،

"بیٹا، لوگ کیا کہیں گے؟ بیٹی کما رہی ہے، بیٹا بیمار ہے۔ میں چاہتی ہوں تم ڈگری کے بعد گھر بسا لو۔ کم از کم ایک رشتے کو ہاں کر دو۔"

فروا نے سنجیدگی سے کہا،

"امی، معاشرہ وہی سمجھتا ہے جو اُس کی نظر کو اچھا لگے۔ میرے خیال میں جب گھر کا مرد بے بس ہو، تو عورت ہی کو قدم باہر نکالنے

پڑتے ہیں۔
اور امی، عورت کی عزت سب سے زیادہ ایک عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگر چاہے تو ڈھال بن جائے، اور اگر چاہے تو رسوا کردے۔
میں شادی تب کروں گی، جب عابس صحت مند ہو کر ماں کا سہارا بن سکے گا۔"
وقت گزرتا گیا اور عابس کی حالت بگڑتی گئی۔
فروا خدا سے معجزے کی امید باندھے رہی۔
ایک دن جب وہ ماہی کے ساتھ کینٹین میں بیٹھی تھی تو ماں کی کال آئی:
"بیٹا فوراً اسپتال آجاؤ، عابس کی حالت بہت خراب ہے۔"
فروا نے لرزتی آواز میں ماہی سے کہا،
"بھائی کی طبیعت خراب ہے، مجھے جانا ہوگا۔"
وہ دوڑتی ہوئی ہسپتال پہنچی، ڈاکٹروں سے رابطہ کیا، دوائیں لیں، اور کئی گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد بھائی کو گھر لائی۔
اگلے دن یونیورسٹی میں ماہی نے پوچھا،
"فروا، کیسا ہے تمھارا بھائی؟"
فروا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے،
"ماہ جبین... تم نہیں جانتیں، میری زندگی گمانوں کی ایک طویل راہ ہے، اور سب سے وحشت ناک گمان یہی ہے کہ شاید میں اپنے بھائی کو کھو دوں گی..."
"عابس گزشتہ چھ ماہ سے گردوں کے عارضے میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹرز نے جلد گردے کی تبدیلی کا کہا ہے۔
میں اُسے گردہ دینا چاہتی ہوں، لیکن آپریشن کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔"
ماہ جبین نے فروا کو گلے لگایا،
"میں تمھارے بھائی کا علاج کراؤں گی۔
میرے ماموں نیفرالوجی کے ماہر ہیں۔
لیکن تمھیں اپنے گمانوں کی دنیا سے نکلنا ہوگا۔ اللہ مایوسی کو پسند نہیں کرتا۔ اور یاد رکھو، گمان کے بعد ہی یقین کا سفر شروع ہوتا ہے۔"
اگلے دن ماہ جبین فروا کے گھر آئی اور اُسے بھائی سمیت ہسپتال لے گئی۔
ماہ جبین کے ماموں نے بغور ساری تفصیلات سنیں، مکمل چیک اپ کیا اور علاج شروع کر دیا۔
کچھ دن بعد گردے کی تبدیلی کا دن آپہنچا۔
فروا نے بھائی کی زندگی کی خاطر اپنے جسم کا ایک حصہ دینے کا فیصلہ کرلیا۔
جب وہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہوئی، تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔
وہ جانتی تھی کہ یہ سفر، جو گمان سے شروع ہوا تھا، شاید اب یقین کی منزل کو پا رہا ہے۔
مگر اُسے یہ گمان بھی نہ تھا...
کہ اس امید کی قیمت، اُس کی اپنی زندگی ہوگی۔

☆☆☆☆☆

سرد لاشیں

سیلاب نے دیہات کے دیہات تباہی سے
دوچار کر دیے تھے۔
ہر جانب موت کا راج تھا ایسا لگ رہا تھا
جیسے یہاں زندگی کبھی تھی ہی نہیں۔
کچھ دیہات صفحۂ ہستی سے مٹ گئے تھے دور
دور تک سرکاری امداد اور بحالی کا امکان
نہیں تھا۔
یہ گاؤں ایسی پہاڑی گزرگاہ پر تھے کہ یہاں
پہنچنا بھی آسان نہیں تھا۔
سیلابی ریلا ان کو روند کر آگے بڑھ گیا تھا
صرف دو بستیاں محفوظ رہی تھیں۔
وہاں کے بچے بوڑھے جوان سب اپنے
اپنے خاندانوں کے ساتھ اپنے تئیں
لٹے پٹے اور اجڑے انسانوں کی مدد کو
لگ گئے تھے۔
ان میں پہاڑ خان بھی شامل تھا۔ یہ پیشہ ور
چور تھا ایسے مواقع اس کے لیے قدرت کا
انعام ہوا کرتے تھے۔
تم کو شرم کیوں نہیں آتی تم ان مرے ہوئے
لوگوں کو نوچ رہے ہو۔ کچھ تو شرم کرو۔

آج پہاڑ خان اپنی بیوی کو ساتھ لایا تھا اس
نے نسبتاً مشکل راستہ چنا تھا اس گاؤں تک
ابھی کوئی نہیں پہنچا تھا کیونکہ یہاں سیلاب کا
زور باقی تھا۔
اس نے بہت دور ایک پناہ گاہ میں اپنے
دونوں بچوں کو چھوڑا۔ بیوی کو ہمراہ لیا اور
لوٹ مار کو نکل گیا۔
دیکھو بس آج چلو اس کے بعد ہمیں کئی سال
ضرورت نہیں ہو گی۔ اس گاؤں سے ہم اتنا
کچھ جمع کر لیں گے کہ سکون ہو جائے گا۔
وہ رخسانہ کہہ رہی تھی کہ اس سائیڈ پر ابھی
خطرہ ہے یہاں پھر کچھ ہو سکتا۔
اس کو چھوڑو میں بچپن سے یہیں پلا بڑھا ہوں۔
یہاں اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا بس یہ ہلکی
پھلکی بارش ہے اور یہ ایک بڑا ریلا۔
مجھے بچوں کی فکر ہو رہی ہے۔
وہ اوپر محفوظ ہیں ان کی فکر نہ کرو۔ وہ دونوں

مرزا صہیب اکرام

صبح سے شام تک مسلسل کوشش کرتے رہے
اس طرح انھوں نے بہت کچھ جمع کر لیا۔ وہ
کئی بار خطرناک جگہ پر گیا اور واپس آیا۔
ایک بار ایک بچی کے کان سے بالیاں کھینچتے
ہوئے اس نے دیکھا بچی حیات تھی۔
اس نے لحظہ بھر کو سوچا اور بچی کا منہ پانی میں
ڈبو دیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت لگا۔
وہ نرم نرم گوشت ٹھنڈا ٹھنڈا لگنے لگا۔
اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے وہ ہانپ رہا تھا
جیسے میلوں بھاگا ہو۔
بارش کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔
خدا کا واسطہ اب واپس چلو۔
واپسی کا سفر مشکل ہو گیا تھا بارش کی رفتار
بڑھتی چلی جا رہی تھی۔
وہ بچوں سے دور ہو رہے تھے محفوظ راستے
سے وہاں تک جانا دشوار ہو گیا تھا۔
سامان کی زیادتی سے چلنے اور چڑھائی میں
رفتار بہت دھیمی ہو رہی تھی۔ وہ اوپر پہنچے پھر
سامان ایک جگہ رکھا اور وہ بچوں کی جانب
چل پڑا۔
اچانک کلاؤڈ برسٹ ہوا اور اس کے اور
بچوں کے بیچ ایک طوفانی یلغار نے راستہ
پاٹ دیا۔ پانی اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔
اس کی بیوی چیخ رہی تھی۔ وہ مدد کو پکار رہا تھا
اس سے دس بیس فٹ کی دوری پر اس کے
دونوں بچے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ رو
رہے تھے۔ وہ سونا اور زیورات زیادہ سے
زیادہ لانے کی کوشش میں اپنی رسی تک نیچے
بھول آیا تھا۔
ایک ریلا آیا اور اس نے اس چٹان کو اپنی
لپیٹ میں لے لیا۔ بچے پانی میں بہہ کر نیچے
کی جانب بہتے چلے جا رہے تھے۔
اس کی بیوی نے تڑپ کر پانی میں چھلانگ
لگا دی۔
لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکا
اس کے پاس زیورات ہی زیورات تھے۔
اس نے اپنا سر منہ نوچا اور سب ہوا میں
اچھال دیا۔
دو دن بعد وہاں امدادی ٹیمیں پہنچیں اور
لاشوں کو نکالا گیا۔
اس کو اپنے بچے مل گئے مگر وہ بہت ٹھنڈے
تھے اس نے ان کو چھوا تو اس کی چیخ نکل گئی۔
وہ پاگل ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

”خاموش محبت...... بندلفافہ“

یہ شہر کا ایک پرانا محلہ ہے۔ گلیوں میں ہروقت چہل پہل رہتی ہے۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے ہیں اور ان کی ہنسی کی قلقاریاں گونج رہی ہیں۔ خواتین گلی کے کونے پر یا دروازوں میں کھڑی گپیں لگا رہی ہیں۔ مرد حضرات کام پر گئے ہوئے ہیں۔ دیواریں سیم زدہ اور ہروقت شور رہتا ہے۔ شہر کی جدید سوسائٹیوں کی طرح یہاں خاموشی نہیں تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے اور دکھ سکھ سے آگاہ رہتے تھے۔

محلے کے بالکل پاس سے نہر گزرتی تھی اور اس کے ایک طرف پارک تھا۔ پارک زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تاہم رنگ برنگے پھولوں، گھنے اور ہرے بھرے درختوں اور ترتیب سے کٹی گھاس نے اسے دلکش بنا دیا تھا۔ لوگ صبح شام یہاں واک کیلیے یا تھوڑا ریلیکس ہونے کے لیے آتے تھے۔ پارک میں مختلف جگہوں پر زنگ آلود بینچ موجود تھے۔ جہاں لوگ تھوڑی دیر بیٹھ جاتے تھے۔

کلثوم حبیب اسی محلے کی رہائشی تھی۔ ایک طالبہ اور نوجوان قلمکارہ۔ تاہم اس کا پروفیشن ٹیچنگ تھا۔ وہ ایم ایس سی کرنے کے ساتھ ایک سکول میں پڑھا بھی رہی تھی۔ روزانہ شام کو اس پارک میں آنا کلثوم کا معمول تھا۔ وہ کچھ دیر واک کرتی۔ بینچ پر بیٹھ کر تھوڑا ریلیکس ہوتی اور گھر آجاتی۔

کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ ایک بزرگ جن کی عمر 50 سے کچھ اوپر ہوگی۔ روزانہ شام کو آتے ہیں۔ ایک گھنے درخت کے نیچے بنے بینچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ خاموشی سے درختوں پہ بیٹھے اور ادھر ادھر اڑتے پرندوں کو دیکھتے رہتے ہیں اور پھر اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ انھیں پارک میں موجود دیگر لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کبھی تو یوں بھی لگتا ہے جیسے وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ ”سناٹا جب روح میں اتر جائے تو رونقیں متاثر نہیں کرتیں“۔ یہ کلثوم کا خیال تھا۔

کلثوم بابا جی کے ساتھ جڑے اس تجسس کو جاننا چاہتی تھی۔ وہ لکھتی تھی، تجسس اس کے خمیر کا حصہ تھا۔ ایک شام واک کے بعد

رانا محمد شاہد

کلثوم بزرگ کے پاس آئی اور کہا۔
''بابا جی آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں''۔
انھوں نے ایک نظر اٹھا کر حیرت سے دیکھا جیسے انھیں یقین نہ آرہا ہو کوئی انہیں بھی پکار سکتا ہے۔
''جی بیٹا---بیٹھ جائیں''۔
اس نے بیٹھتے ہی سوال جڑ دیا۔
''بابا جی آپ روزانہ یہاں آتے ہیں تو آپ کے ہاتھ میں ایک لفافہ لازمی ہوتا ہے۔ یہ کیا ہے اور یہ ہر وقت آپ کے ہاتھ میں کیوں ہوتا ہے؟''
بابا جی تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر دھیرے سے بولے۔
''اس زرد رنگ کے لفافے میں میری زندگی کی کہانی ہے---''۔ یہ کہہ کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے۔ پھر بولے۔
''یہ زرد لفافہ منزل تک نہیں پہنچ پایا اور پھر-----''
''پھر کیا بابا جی---''
''پھر یہ کہ میری زندگی بھی اس زرد لفافے کی طرح ہمیشہ کے لیے زرد ہو گئی----''
اب کلثوم کا تجسس بڑھا کہ آخر اس زرد لفافے میں ایسا کیا ہے۔
اس دن تو وہ خاموش رہی۔ مگر اگلے روز بابا جی کے پاس بینچ پر بیٹھتے ہی کہا۔
''بابا جی کیا میں یہ لفافہ کھول کر دیکھ سکتی ہوں----''
''آپ کیوں دیکھنا چاہتی ہیں''۔
''دراصل میں ایک رائٹر ہوں، جاننا چاہتی ہوں کہ اس لفافے کے اندر کیا کہانی ہے''۔
''اپنی اس حالت کا میں خود ہی ذمہ دار ہوں---'' بابا جی نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔اس دوران ایک پرندہ سامنے گھاس پر آ بیٹھا۔ انھوں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔
''خاموش اور خود ساختہ تعلقات اس بت کی طرح ہوتے ہیں۔ جنھیں انسان خود ہی بناتا اور تراشتا چلا جاتا ہے۔ روز بناتا ہے، روز تراشتا ہے۔ یہ سوچ بنا کہ خیال کے یہ بت اس کے جذبات کا مداوا نہیں کریں گے۔ وہ خوش فہمی کے ساتھ رکتا ہی نہیں۔ وہ انہی خیالات کے ساتھ اتنی مسافت طے کر لیتا ہے کہ جا کر بھی واپسی ممکن نہیں رہتی''۔ بابا جی باتوں میں گہرا دکھ پنہاں تھا۔
''مجھے ہر صورت یہ خط حاصل کرنا ہے--- کسی بھی طرح ----یہ خط نہیں ---ایک گہری بے صدا اور ان کہی کہانی ہے''۔ کلثوم نے خود کلامی کی۔
دو دن بعد کلثوم کی باتوں اور تجسس کو دیکھتے ہوئے بابا جی نے وہ لفافہ اسے تھما دیا۔ لفافہ حاصل کرتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آسمان پر گھیرے بادل تھے۔ بارش کسی بھی وقت آسکتی تھی۔ پارک میں اب اکا دکا لوگ ہی رہ گئے تھے۔ بابا جی کی امانت لیکر وہ جلدی سے گھر آ گئی۔ ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ اگر وہ تیز قدم نہ اٹھاتی تو ساری بھیگ جاتی، اس لیے کہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی تیز بارش نے

آ گیا۔ کمرے میں بیٹھ کر لفافہ کھولنے سے پہلے وہ سوچنے لگی۔

"اس لفافے کے اندر اس بزرگ کے دکھوں کی بارش ہوگی۔ جس میں وہ ساری زندگی بھیگتے رہے اور شاید اب بھی بھیگ رہے ہیں"۔

لفافہ کھولا تو اوپر تاریخ درج تھی۔ "16 مارچ 1996----

میری کائنات---"

یعنی 30 سال پرانا خط تھا۔ خط کے شروع میں محبت کا اظہار تھا، عہد و پیماں تھے اور آخر میں لکھا تھا۔

"آپ کو کاغذ کا یہ ٹکڑا مل جائے تو مجھ سے رابطہ ضرور کیجیے گا۔ کچھ اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں"۔

اور وہ اہم باتیں پھر کائنات تک نہ پہنچ سکیں۔

اگلے روز وہ واک کے لیے پارک پہنچی تو بابا جی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تھے۔ اس نے واک کا ارادہ ترک کیا اور ان کے پاس چلی آئی۔

"میں نے آپ کا خط پڑھا ہے۔ لکھنے کے بعد خط پہنچانے میں رکاوٹ کیا بنی؟"۔

سوال میں تجسس نمایاں تھا۔

"کچھ نہیں--- کائنات نے خود ایک بار مجھے کہا تھا۔ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں یا کوئی خط بھیجنا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ مگر میں کوئی ایسا کام نہیں چاہتی جس سے مجھے اپنے کردار کی وضاحت دینی پڑے"۔

"تو گویا خط چھپا کر یا خاموش رہ کر آپ نے اپنی محبت چھپالی"۔ کلثوم تیزی سے بولی۔

"چھپالی یا شاید بچالی---"۔ وہ بزرگ کرب سے بولے۔

"آپ نے یہ خط کائنات تک نہیں پہنچایا-- کوشش بھی نہیں کی"۔ کلثوم پوچھ رہی تھی۔

"کی تھی۔ دو تین بار۔ آخری کوشش میں اس کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ ڈور بل پر ہاتھ رکھنے ہی والا تھا کہ پھر ایک خیال نے ہاتھ روک دیا۔ کائنات نے ایک بار کہا تھا۔ ایک لڑکی کا کردار ہی اس کی زندگی، اس کی خوشیوں کی ضمانت ہوتا ہے۔ اگر کردار کھو گیا تو سب کچھ کھو گیا۔ سوچا میری اس حرکت سے کہیں کائنات کے کردار پر حرف نہ آ جائے۔ خاموشی سے چلا گیا"۔ بابا جی خاموش ہوئے تو کلثوم نے فوراً کہا۔

"پھر آپ دوبارہ کائنات سے نہیں ملے"۔

"نہیں--- کبھی نہیں۔ شاید اسی لیے آپ کو 40 کا نہیں 50 سے اوپر کا لگ رہا ہوں---" یہ کہتے ہوئے بابا جی ہلکا سا مسکرائے مگر یہ مسکراہٹ کہیں سے بھی نہیں تھی۔ باتوں اور چہرے سے دکھ واضح تھا۔

وہ حیران تھی کہ چہرے سے دس، پندرہ سال کا فرق۔ اس کا اندازہ غلط ہو گیا۔

"دکھ اور جذبات بھرے دکھ انسان کو توڑ دیتے ہیں اور ٹوٹے پھوٹے وجود اندازے غلط کر دیتے ہیں"۔ کلثوم نے سوچتے ہوئے ایک اور سوال داغ دیا۔

"آپ کو قلق ہوتا ہے کہ کاش ایک بار

کائنات مل لیتی یا وہ یہ خط ہی پڑھ لیتی"۔
"ہاں ہوتا ہے مگر اب زندگی کا یہ خسارہ ہی اپنا سب کچھ ہے۔ اپنے جذبات کو اپنے اندر رکھنے سے بڑا دکھ کیا ہوگا۔۔۔ میں نے اپنے جذبات اگر قلم کے سپرد کیے بھی تو اس تک نہیں پہنچا پایا۔۔۔ جو میرا سب کچھ تھی۔۔۔ میری کل کائنات۔۔۔۔ میری کائنات"۔ کلثوم بابا جی کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ یہ کہتے کہتے بمشکل ایک آنسو ان کی آنکھ سے نکلا اور رخساروں میں ہی کہیں جذب ہو گیا۔
"آپ کو کیا لگتا ہے۔۔ محبت صرف عورت کرتی ہے۔ شاید محبت میں ہارا ہوا مرد کسی نے نہیں دیکھا۔ مرد مجبوری، بے بسی حتیٰ کہ اپنی شکست کو چہرے پر لاتا ہے اور نہ دکھ کو آنکھوں سے بہاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی مات کو خاموشی سے قبول کر لیتا ہے۔ اپنے زخم کو سینے میں دبا لیتا ہے اور پھر وہی زخم ایک ناسور کی صورت اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتے ہیں۔ بالکل ایسی ہی کیفیت بابا جی کی ہے۔" یہ کلثوم حبیب کے خیالات تھے۔
بابا جی سے ملنے کے بعد وہ سوچ رہی تھی۔ خوشیاں خوب صورت جسموں کے لیے ہیں اور غم خوب صورت روحوں کے لیے اور بابا جی سے زیادہ خوب صورت روح کیا ہوگی۔ جنھوں نے اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دیا۔ اپنے غم کو برسوں چھپائے رکھا۔ خود زندہ لاش بن گئے مگر محبوب اپنی شدت کی بھنک نہ پڑنے دی۔
بابا جی سے ملنے کے بعد کلثوم گھر پہنچی تو اسی وقت شہباز کا فون آ گیا۔
"کلثوم کدھر ہو بھئی۔۔۔ تین دن سے فون کر رہا ہوں۔۔۔ کوئی لفٹ نہیں۔۔ خیریت تو ہے نا۔"
"ہاں میں ٹھیک ہوں"۔۔۔ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔
"تمھیں تو پتا ہے، میں تم سے روزانہ بات کرنا چاہتا ہوں"۔
"اور روزانہ ہی اظہار محبت بھی۔۔۔" اس نے تلخی سے کہا تو وہ فوراً بولا۔ "تو کیوں نہ کروں۔۔۔ جو دل میں ہے۔۔ روزانہ کہوں گا۔" کلثوم نے ی سنتے ہی کال ڈراپ کر دی۔
"اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دینے والے اب کہاں رہے۔۔۔"۔ وہ شہباز کی محبت کا بابا جی سے موازنہ کر رہی تھی۔
"وہ بھی لوگ تھے۔ اتنے سچے کی محبت ہوئی بھی تو خاموشی میں زندگی گزار دی۔ ایسی خاموشی۔۔۔ ایسی قربانی۔۔۔ محبت میں قربانی کون دیتا ہے۔ اپنی محبت کسی اور کی ہو جائے اور انسان خاموش رہے۔۔۔ ناممکن۔۔۔
پھر اس نے خاموش محبت کی اس کہانی کو لفظوں کا پیرہن عطا کیا۔ اسے ایک ادبی جریدے میں بھیجا۔ اگلے مہینے شائع بھی ہو گئی۔
وہ محبت جو لفظوں میں روپ نہیں دھار سکی تھی اور سینوں میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے آج کلثوم حبیب نے زندہ کر دیا تھا۔ اپنے لفظ عطا کر کے۔

☆☆☆☆☆

”شکر کی چھاؤں“

صفورا پرویز

حد سے تجاوز کرنے والی ہر شے زحمت بن جاتی ہے۔

جیسے بارش---

پہلا قطرہ چہرے پر پڑتے ہی رحیم نے چھت سے امی کو آواز لگاتے پکوڑوں کی فرمائش کی۔

”تیل کی قیمت دیکھی ہے؟ یہاں ہانڈی میں تیل پورا نہیں ہو رہا پانی میں تل دوں پکوڑے۔“

امی نے غصے سے جواب دیا تو چھت پہ رحیم کے ساتھ کھڑی رحیمہ کے چہرے پر اداسی پھیل گئی۔

”اداس کیوں ہوتی ہو پاگل، امی اپنے دھلے ہوئے کپڑوں کو لے کر پریشان ہیں۔ کپڑوں میں بدبو آ گئی تو سرف، بجلی اور محنت تینوں ضائع ہو جائیں گی۔ یوں بھی آج کل بارشیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔“

”ہمیں آج بھی نیچے گھٹن میں سونا پڑے گا رحیم۔“

وہ اس کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں آسمان کو گھورتے بولی تو رحیم نے گہرا سانس بھرا۔

”جانتا ہوں۔“

اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

”ہم کب لوگوں کی طرح بارش میں لطف اٹھائیں گے؟“

وہ اب بھی آسمان کو تکتے بول رہی تھی رحیم کو لگا وہ اللہ سے مخاطب ہے۔

ہمارے پاس بارش سے بچنے کے لیے کمرہ چھت تو ہے رحیمہ ان لوگوں کا سوچو جن کی کپڑے کی بنی جھونپڑی اپنے سمیت ان کو بھی بھگوڈالتی ہے۔

وہ اسے مایوس دیکھ کر افسردہ نظر آتا تھا۔

ابو کہتے ہیں اللہ بہت منصف ہے۔ لیکن کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ ہمیں وہ سب میسر کیوں نہیں جو چچا بشیر کے خاندان کو میسر ہے؟

اللہ کی نعمتیں ان کے لیے ہیں ہمارے لیے کیوں نہیں۔؟

بارش اب تیز ہونے لگی تھی۔ بوندیں پہلے کی نسبت موٹی نظر آنے لگی تھی۔ رحیمہ بوندوں کی بوچھاڑ سے بچنے کی خاطر سیڑھیاں اترتے غم سے ہلکان ہوتے بولتے جا رہی تھی۔

”اللہ کی نعمتیں سب کے پاس اور بے حساب ہوتی ہیں رحیمہ۔ بس انسان کو تب

تک احساس نہیں ہوتا جب تک وہ چھن نہ جائیں۔"

رحیم نے سیڑھیاں اترتے راہداری میں کھڑے ہو کر اسے جواب دیا۔ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نرم تھا۔

رحیمہ نے الجھن بھری نگاہ اپنے بھائی کی طرف اٹھائی، یوں جیسے وہ اپنی اس تنگ زندگی میں نعمتوں کے انبار کے بارے میں جاننا چاہتی ہو۔

رحیم اس کے انداز پر مسکرایا۔

"ہمارا ساتھ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ بشیر چچا کا بیٹا، ارحم، دبئی میں ہے۔ کبھی تم نے افشین سے پوچھا ہے وہ اپنے بھائی کے ساتھ آخری بار کب بیٹھی تھی؟"

بشیر چچا نے آخری بار اسے کب گلے لگایا تھا؟

رحیمہ راہداری سے نظر آتے تھوڑے سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس بھرنے لگی۔ بوندیں دیوار سے ٹکراتے نیچے برآمدے میں گر رہی تھیں۔

"میں ناشکری تو نہیں کر رہی... بس ایک اچھے گھر کی خواہش کر رہی ہوں۔"

وہ کچھ اداسی سے بولی۔

رحیم اس کے جذبات سمجھتا تھا۔ ایک محفوظ چھت اور چار دیواری کی خواہش کس نفس کو نہیں ہوتی؟

اس نے نرمی سے رحیمہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"خواہشیں شکر کرنے پر پوری ہوتی ہیں۔ اس کچے گھر کی شکرگزاری ہی ہمیں بہت سی نعمتوں سے نوازے گی۔ اور تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔"

"مجھے بہت سی نعمتوں سے بھی خوف آتا ہے، رحیم۔"

وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

وہ امی کو برآمدے کے کونے میں کپڑے پھیلاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"وہ کیوں؟"

رحیم نے چونک کر پوچھا۔

"مجھے اللہ سے پکا مکان نہیں، گھر چاہیے۔ پکے مکان تو سب کے پاس ہوتے ہیں مگر "گھر" کسی کسی کا نصیب ہوتا ہے، مجھے صرف اچھا کھانا نہیں، ہمارا بھی ساتھ بھی چاہیے۔ کھانے کی میز سب کے پاس ہوتی ہے، پر ساتھ بیٹھ کے کھلانے والے کسی کسی کے نصیب میں ہوتے ہیں۔ مجھے ایسی خوشی کی خواہش ہے جو غم کے بغیر ہو، ایسی نعمت کی چاہ ہے جو عافیت کے ساتھ ہو۔"

وہ یاسیت سے بول رہی تھی۔

"اللہ کو کچھ مشکل نہیں، رحیمہ۔ وہ چاہے تو یہ سب دے دے، چاہے تو اسی سب سے آزمالے۔"

رحیم نرمی سے بولا تھا لیکن رحیمہ نے دہل کر اس کی طرف دیکھا۔

"اللہ مجھے کبھی ان خوابوں سے نہ آزمائے۔ مجھے آزمائش سے ڈر لگتا ہے رحیم، ایسی

باتیں مت کرو۔''

اس کی آنکھیں لمحے میں بھر آئیں تھیں، وہ خفا خفا سی امی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ جو اسے اپنے گیلے کپڑوں کا دکھ سنانے لگیں تھیں۔

رحیم نے اداسی سے ان دونوں کو دیکھا اور موبائل نکال کر ایک میل کا جواب دیا۔ پھر فون جیب میں ڈال کر نیچے آیا تو ابو گھر میں داخل ہوتے نظر آئے۔ کپڑے بھیگے ہوئے، جوتا ٹوٹا ہوا، ہاتھ پر زخم بھی تھا شاید کیچڑ میں پھسل گئے تھے۔ رحیم کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''یہ کیسے لگ گئی ابو؟''

وہ متفکر سا ان کی طرف بڑھتے ان کا ہاتھ دیکھنے لگا۔

''بس بیٹا، راستے بہت خراب ہیں۔ چھوٹا سا زخم ہے، فکر نہ کرو۔''

ابو نے اس کا شانہ تھپتھپاتے پیار سے کہا۔

امی اور رحیمہ فوراً ان کی طرف لپکیں۔ ایک کمرے کا گھر چھوٹا سا برآمدہ اور آگے صحن، وہ سب جلدی سے ان کے گرد جمع ہو گئے۔

ابو کا دل محبت سے بھر گیا۔ دن بھر کی تھکن غائب ہوتی محسوس ہوئی۔

جب تک ابو برآمدے میں پہنچے، رحیمہ دودھ چولہے پر چڑھا چکی تھی۔ وہ ابو کو دودھ میں ہلدی ڈال کر دینا چاہتی تھی۔

''سڑک سے رگڑ لگی ہے کیا؟ ٹیکہ لگوایا تھا؟ بازو تو نہیں دکھ رہا؟''

امی نے ایک ساتھ اتنے سوال کیے کہ ابو ہنس پڑے۔

''میں ٹھیک ہوں رضیہ، معمولی سی خراش ہے۔''

''رہنے دیں آپ... آپ کے لیے ہر زخم معمولی خراش ہی ہوتا ہے۔''

امی ان کا ہاتھ پکڑ کر جانچتی بڑبڑاتے ہوئے بولیں۔

صحن میں چولہے کے پاس کھڑے رحیم اور رحیمہ یہ منظر دیکھ کر مسکرا دیے۔

دودھ کو ابال آیا تو رحیمہ نے ہلدی ڈال کر ابو کو دیا۔ ابو نے رحیمہ کو پیار سے اسے سینے سے لگایا۔

''میرا ہیرا بچہ!''

رحیمہ کا دل محبت سے بھر آیا۔ ماں باپ کی شفقت سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے؟ وہ رحیم کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ بھی جواباً مسکرا دیا۔

وہ جانتا تھا اس کی بہن پھر مایوسی کے سائے سے نکل آئی ہے۔ وہ ایسی ہی تھی...... پل میں شکوہ کرتی، پل میں شکر۔

اگلا دن خاصا روشن تھا، مگر رحیمہ کے لیے وہ روشنی اندھیروں میں لپٹی ہوئی تھی۔

رحیم نے جو خبر سنائی تھی، اس نے سب کے اندر ایک گہرا سناٹا بھر دیا تھا۔

رحیم باہر جانا چاہتا تھا۔ ارحم نے اسے باہر بلانے کا ذمہ لیا تھا۔ امی اور ابو نے اس کے مستقبل کے خیال سے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن رحیمہ... اس نے ایک لفظ نہیں

کہا تھا، وہ خاموش تھی۔
رحیم کو اس کی خاموشی نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ غمگین ہے۔ آخر وہ دونوں ایک دوسرے کے ہمراز تھے، ایک دوسرے سے ہر بات بانٹتے تھے۔ لیکن یہ فیصلہ، یہ خواہش، رحیم نے اس سے چھپائی تھی۔
وہ جانتا تھا، اگر وہ اسے پہلے بتا دیتا تو رحیمہ سیدھا ارحم کو کال کر کے اسے ہی سخت سست سنا دیتی۔ ارحم ایسے بھی اسے پسند نہیں تھا۔
اس دن آسمان صاف تھا۔ بادل، رحیمہ کی طرح، خاموش اور ساکت لگ رہے تھے۔
وہ وقت سے پہلے ہی چھت پے جا کر لیٹ گئی۔ آنکھیں موند کر یوں سونے کا ڈھونگ رچایا جیسے دنیا سے کٹ گئی ہو۔
رحیم آہستہ سے اس کے پیچھے آیا۔ کچھ دیر اپنی چارپائی پہ بیٹھے اسے دیکھتا رہا، پھر دھیرے سے اسے آواز دی:
"رحیمہ---"
لیکن وہ، آنکھیں موندے، یونہی سوتی بنی رہی۔
"ناراض ہو؟"
رحیم نے اس کے بال کھینچ کر پوچھا۔
جواب ندارد۔
"ارحم..."
وہ اسے کچھ بتانا چاہتا تھا---
"نام مت لو اس منحوس کا میرے سامنے!"
وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس قدر تپ کر بولی کہ رحیم کو ہنسی آ گئی۔
اسے ہنستے دیکھ رحیمہ کا دل بھر آیا۔
"ہنسو، دل کھول کر ہنسو۔ ظاہر ہے تم تو خوش ہی ہو گے، باہر جو جا رہے ہو اس جہنم سے۔
اس کے لہجے میں نفرت تھی، غصہ یا حقارت، رحیم اندازہ نہ لگا سکا۔
"میں اپنوں سے دور ہو کر خوش کیسے رہ سکتا ہوں رحیمہ؟"
وہ دکھی لگتا تھا۔
"جس طرح ارحم رہتا ہے"
خفا خفا سا جواب آیا۔
"امی کہتی ہیں باہر جانے والے واپس نہیں آیا کرتے"۔
اب وہ تمہیں کس دل سے بھیج رہی ہیں؟ کل تک تم مجھے افشین کے دکھ سنا رہے تھے اور آج وہی دکھ ہمارے حصے میں لکھ رہے ہو۔"
اس کا لہجہ رندھا ہوا تھا۔ آنسو چہرہ بھگو چکے تھے، جسم لرزنے لگا۔ وہ حساس تھی، جذبات کی شدت برداشت نہیں کر پاتی تھی۔
رحیم اس کے قریب آ بیٹھا، اس کا سر اپنے شانے پر رکھا۔ سیڑھیوں میں کھڑے امی اور ابو نے یہ منظر نم آنکھوں سے دیکھا اور آہستہ سے سیڑھیاں اترتے راہداری میں بچھی چارپائی پر جا بیٹھے۔
اولاد کی جدائی ہر غم سے بھاری، اور اولاد کا دکھ ہر زخم سے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت دونوں کرب جھیل رہے تھے۔ ایک جدا ہونے جا رہا تھا اور دوسرا جدائی کے زخم میں چھلنی۔
"میں جدائی کی مار کھانے کو تیار ہوا ہوں،

رحیمہ۔ امی کے لیے، ابو کے لیے......
تمہارے لیے۔"

رحیم کی آنکھیں نم تھیں، مگر لہجہ مضبوط، بالکل ایک بڑے، ذمہ دار بیٹے کی طرح۔

امی ابو ان کی باتیں باآسانی سن سکتے تھے۔ امی مسلسل آنسو بہا رہی تھی اور ابو ان کی پیٹھ تھپتھپا رہے تھے۔

"مجھے آج اگر حالات بدلنے کا موقع مل رہا ہے تو میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ اللہ نے کرم کیا ہے، شکر کرنا چاہیے، شکوہ نہیں۔"

وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر رحیمہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

"میں نے تمہاری جدائی کے بدلے تو کچھ نہیں مانگا تھا۔ مجھے گھر چاہیے تھا، مکان نہیں۔ مجھے چند نعمتیں چاہیے تھیں، نعمتوں کا انبار نہیں!"

وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔

"تم ناشکری کر رہی ہو، رحیمہ۔"

"میں ناشکری نہیں کر رہی۔" وہ چیخ پڑی تھی۔

رحیم نے اس کے ہاتھ تھامے، اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہارا بھائی کامیاب انسان بنے؟"

"چاہتی ہوں..."

اس کا لہجہ خفا اور رویا ہوا تھا۔

رحیم مسکرا دیا۔

"میں بھی چاہتا ہوں تم کامیاب بنو، رحیمہ۔ لیکن یہاں رہ کر تمہاری فیس تک ادا نہیں کر سکوں گا۔"

"میں نے تم سے ایسی کوئی خواہش نہیں کی..."

اس کے لہجے میں بے پناہ اداسی تھی۔

"پر یہ میری خواہش ہے۔ میں چاہتا ہوں میری بہن اس خاندان کی سب سے پڑھی لکھی لڑکی کہلائے۔"

وہ اس کی ناک کھینچتے بولا۔

"کیا تم اپنے بھائی کی خواہش پوری نہیں کر سکتیں؟"

وہ سر جھکا کے رو دی۔

"میں تمہارے بغیر ایڈمیشن کیسے لوں گی؟ مجھے چھوڑنے کون جائے گا؟ میرے ساتھ چائے کون پیے گا؟ میں باتیں کس سے کروں گی؟ مجھے تمہارے بغیر رہنا نہیں آتا، رحیم...... میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی؟"

اس کے الفاظ نے رحیم کے ضبط کے بند بھی توڑ دیے تھے۔ سیڑھیوں کے نیچے بیٹھے ماں باپ کے دل بھی کچھ اور زخمی ہوئے۔

فکرِ معاش بہت بڑی قربانی مانگ رہی تھی۔

رحیم نے بہن کا سر دوبارہ شانے سے لگایا۔

"مجھے بھی تمہارے بغیر رہنے کی عادت نہیں ہے، رحیمہ۔ لیکن زندگی ایسی ہی تلخ ہے۔ یہ ہمیشہ بدلے میں کچھ مانگتی ہے۔ یہ زندگی زندگی ہے، عالمِ آزمائش۔ ہمیں صبر اور شکر کرنا ہے۔ یقین رکھو، اس جدائی کی بھی اجرت ملے گی۔"

وہ دھیرے سے بولا:

"میں روز فون کروں گا، جب وقت ملا میسج کروں گا۔ اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم پھر ایک چھت تلے، ایک آسمان تلے ساتھ ہوں گے۔"

وہ رات گھر کے چار افراد پر بہت بھاری تھی۔ مگر رات ہی تو تھی...... اسے گزرنا تھا سو گزر گئی۔

اگلی صبح آسمان پھر سے برسنے لگا تھا۔

رحیمہ نے کمرے کے در و دیوار کو خالی نظروں سے دیکھا۔ بارش ہلکی تھی مگر کمرے کی دیوار کے کونے سے پانی پھر بھی ٹپک رہا تھا، اور چھوٹے چھوٹے کیڑے دیوار پر چڑھتے کسی ان - دیکھی منزل کی طرف جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

امی سامنے بیٹھی کپڑے تہہ کر رہی تھیں مگر آنکھوں کے کناروں پر نمی صاف جھلک رہی تھی۔ وہ چھپانا چاہتی تھیں مگر بیٹی سے کہاں تک چھپاتی؟

"امی..."

رحیمہ نے آہستہ سے پکارا۔

امی نے چہرہ موڑ لیا، جیسے نہ سننے کا بہانہ کر رہی ہوں۔

"امی، آپ رو رہی ہیں؟"

امی اداسی سے مسکرائیں۔۔

نہیں تو، میں کیوں رونے لگی۔

رحیمہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

"امی، آپ رحیم کے جانے پر افسردہ ہیں۔ تو مان جانے میں کیا قباحت ہے۔

وہ جاننا چاہتی تھی۔

امی کے ہاتھ تھم گئے۔

"ماؤں کے پاس ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا۔"

وہ نم آواز میں بولیں۔۔

رحیمہ نے آگے بڑھ کر ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

"امی، مجھے لگتا ہے ہمارا گھر ٹوٹ جائے گا۔"

امی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے اُسے دیکھا، مگر آنکھوں کی نمی اب اور نہ چھپ سکی۔

"گھر دیواروں اور چھت سے نہیں بنتے رحیمہ۔ گھر دلوں سے بنتے ہیں۔ اگر دل جڑے رہیں تو گھر کبھی نہیں ٹوٹتے۔"

میں افسردہ نہیں ہوں، اپنے بچے کے لیے پریشان ہوں، میں خوش بھی ہوں اور نہیں بھی میرے پاس اپنے جذبات بتانے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

بارش تھم چکی تھی۔ چھت پر رکھے ٹوٹے گھڑے میں پانی بھرا تھا جس پر عجیب قسم کے کیڑے منڈلانے لگے تھے۔

رحیم نے آ کر اسے خالی کیا۔

تمہیں ان چیزوں کا خیال رکھنا ہے رحیمہ۔

آج کل رحیم ایسے ہی اسے ہر چھوٹی بڑی بات سمجھا اور سکھا رہا تھا۔ آن لائن ٹرانسکشن کیسے ہوتی ہے، آن لائن رائیڈ کیسے بک ہوتی ہے۔ گیس کیسے رکھ کر ٹھوکنا ہے، پانی والے سے کیسی بوتل لینی ہے وہ اس کو سب

سکھا دینا چاہتا تھا۔
میں رحیمہ ہوں یا روبوٹ وہ چڑ کر بولی تو وہ ہنس دیا۔
تم میرا بازو ہو۔
وہ اس کے بال بگاڑتے بولا تو اب کی بار وہ ہنس دی۔
عموماً بھائی یہ ڈائیلاگ اپنے بھائیوں کو بولتے ہیں۔
وہ مسکرا کر بولی تو وہ بھی مسکرا دیا۔
ضروری نہیں بھائی ہی بھائی کا بازو ہو۔ بہن بھائی ایک دوسرے کے بازو ہی ہوتے ہیں۔
اور تم میرا مضبوط بازو ہو وہ محبت سے بولا تو رحیمہ کا سر فخر سے بلند ہونے لگا۔
لمحے بیتے، دن چڑھے راتیں گزری اور پھر وہ دن آیا جب رحیم ایئرپورٹ کے باہر کھڑا تھا۔
بشیر چچا اپنی گاڑی میں اسے چھوڑنے آئے تھے۔ نذیر نے خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن امی اور رحیمہ کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔
رحیم ابو کے گلے ملا، امی سے پیار لیا، پھر رحیمہ کے ہاتھ تھامے کھڑا ہو گیا۔
''تم میرا بازو ہو رحیمہ، میری شہزادی بھی، میری دوست بھی، میرا سپاہی بھی... ہو نا؟''
رحیمہ نے نم آنکھوں سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔
''میں تمہیں بہت یاد کروں گی... اپنا بہت خیال رکھنا۔ اور جاتے ہی ارحم کو سات آٹھ مکے لگانا!''
اس نے دانت کچکچاتے کہا تو سب ہنس دیے۔
رحیم نے اسے گلے لگایا، پھر اس کا سر چوم کر رخ موڑ لیا۔
''اللہ نگہبان۔''
اس کے مڑنے پر سب کی زبان نے ایک ہی ورد کیا۔
''اللہ کی امان۔''
رحیم نے بھی آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے گھرانے کو اللہ کے حوالے کیا۔ اس کی آنکھوں کی نمی واضح تھی، مگر چہرے پر اداسی کے ساتھ ایک عزم بھی تھا۔
زندگی تلخ تھی تو اسے بھی تلخ ہونا تھا۔ کچھ کرنا تھا، کچھ بننا تھا۔ اپنوں کی خواہشوں کی تکمیل اگر اپنوں کی جدائی سہہ کر ہونی تھی تو وہ یہ قربانی دینے کو تیار تھا۔
اس کا ہر قدم اسے اپنوں سے دور، مگر کامیابی کے قریب لے جا رہا تھا۔
زندگی.. ایک ایسا امتحان ہے، جو فقر و فاقہ کے ہاتھوں وہ سب کروا دیتی ہے کہ انسان کبھی کبھی اپنی قربانیوں پر بھی حیران رہ جاتا ہے۔
وہ سب بھی ایسے ہی حیران تھے، امی جو اس کے تیس سیکنڈ دیر ہو جانے پر تڑپ جاتی تھی اب دوسرے ملک جاتے دیکھنے کا حوصلہ کر رہی تھیں۔ ابو جو کبھی اپنے بیٹے کو باہر نہ بھیجنے کا عزم کیے بیٹھے تھے بیٹے کی خواہش پر خاموش ہو گئے تھے۔ بہن جو دوسرے شہر کی دوری برداشت کرنے کی روادار نہیں تھی دوسرے ملک کی جدائی سہن کرنے چلی تھی۔ زندگی مسلسل امتحان ہے۔ ایئرپورٹ پہ کھڑا ہر شخص اس بات کا

گواہ تھا۔
دبئی پہنچ کر سب سے پہلا فون۔ اس نے رحیمہ کو کیا تھا۔
''رحیمہ! دیکھو... یہ میرا کمرہ ہے۔''
وہ کیمرہ گھماتے ہوئے خوشی سے بتا رہا تھا۔
رحیمہ کی آنکھوں میں ایک پل چمک لہرائی، مگر اگلے ہی لمحے دل خالی سا لگنے لگا۔
''تمھارے بغیر سب کتنا عجیب ہے... خالی خالی سا۔''
اس کے لہجے کی اداسی چھپائے نہ چھپ سکی۔
ارحم، جو کمرے میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر کچھ دیکھ رہا تھا، غیر ارادی طور پر ان کی باتیں سننے لگا۔
رحیم نے بہن کو دیکھ کر گہرا سانس بھرا اور کیمرہ اپنی طرف کیا۔
''پاگل! میں روز کال کروں گا نا۔ تمھیں یاد نہیں آنے دوں گا۔''
رحیمہ نے ناک سکیڑی۔
''ابھی ایسے کہہ رہے ہو... بعد میں بھول جاؤ گے۔''
وہ غصے سے بولی تو ارحم نے آنکھیں گھما لیں۔
رحیم ہنستے ہوئے بہن کو منانے لگا۔
''تم میرا اسپاہی ہو، میرا بازو ہو!''
''ہاں، پتا ہے مجھے۔'' رحیمہ نے خفا سا منہ بنایا۔
اچانک اسے کچھ یاد آیا۔
''تم نے میرا کام کیا کہ نہیں؟ میں نے کہا تھا اس منحوس کو اٹھارہ مکے مارنا... بلکہ سیدھی ناک ہی توڑ دینا! ارحم برہم کہیں کا۔''
وہ دانت کچکچا کر بولی، ارحم کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ رحیم ایک دم خجل سا ہو گیا۔
ارحم نے لیپ ٹاپ بیڈ پر رکھتے رحیم کی طرف قدم بڑھائے۔
''رحیمہ... بری بات بیٹے!''
امی نے ڈپٹتے ہوئے کہا تو رحیمہ ناک سکیڑ کے چپ ہو گئی۔
اسی لمحے ایک بھاری سی آواز فون پر ابھری:
''السلام علیکم، تائی امی! کیسی ہیں آپ؟''
رحیمہ کے ہاتھ سے موبائل تقریباً چھوٹ گیا۔
فون میں رحیم کے بجائے ارحم کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر اس کا دل سو کی رفتار سے دھڑکنے لگا۔
جیسے اگلے ہی لمحے وہ فون سے نکل کر اس کی ناک توڑ دے گا۔
امی نے جلدی سے فون سنبھالا۔
''کیا کرتی ہو، رحیمہ؟''
رحیمہ بغیر کچھ کہے چھت پر بھاگ گئی۔
رحیم نے کان کھجاتے ارحم کی طرف دیکھا۔
ارحم نے رضیہ سے سلام دعا کرتے رحیم کو فون واپس پکڑایا۔
وہ رحیمہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلوانا چاہتا تھا۔ کیوں چاہتا تھا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔
''مجھے نہیں پتا تھا کہ رحیمہ مجھے اتنا ناپسند کرتی ہے۔''
فون بند ہوا تو ارحم نے دھیرے سے کہا۔
رحیم ہنس دیا۔
''ایسا کچھ نہیں۔ وہ بس اداس ہے۔''
[جاری ہے۔]

غزل

اہلِ زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہرِ جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

اے تغیّر مست وہ بھی اک تغیّر کیش ہے
تازہ خواروں کے لیے تازہ گھٹا آنے کو ہے

وہ ستم ایجاد عرشِ ارتقا کا رنگ ہے
تازہ کاروں کے لیے تازہ قضا آنے کو ہے

اے صفِ ماتم ٹھہر، اے مجلسِ گریہ سنبھل!
تازہ دم، تازہ نفس، تازہ رثا آنے کو ہے

پاپہ گِل، سر در فلک، خستہ مکانوں کے لیے
کیا کوئی، تازہ جرس، تازہ صلا آنے کو ہے

اک ثنا خواں کے لیے، اک مدح ساماں کے لیے
قریۂ احمد سے اک تازہ ردا آنے کو ہے

وہ تواتر ساز بھی ہے، وہ تسلسل باف بھی
تازہ حیرت کے لیے تازہ ندا آنے کو ہے

بہرِ مسمارِ ستم، پھر، شہرِ گل سے تازہ دم
تازہ پا، تازہ سفر، تازہ صدا آنے کو ہے

خالد احمد

غزل

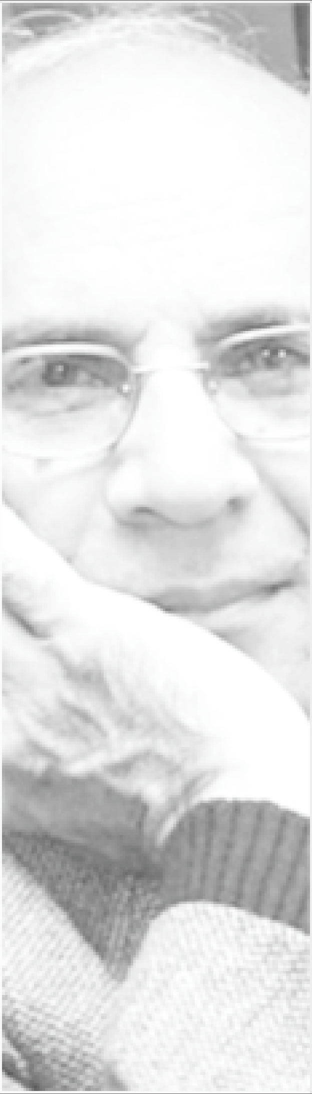

شقاوتوں میں کمی بے سبب نہیں کرتا
دل اور ڈرتا ہے وہ جور جب نہیں کرتا

کشیدگی کا کوئی احتمال ہی نہ رہے
تراش لیتا ہے سر خم طلب نہیں کرتا

سمجھتی ہے اسے احسان اُس کا خلقتِ شہر
کہ قتل کرتا ہے وہ جاں بلب نہیں کرتا

رفیقِ حجرۂ دل کیا بنا سکے وہ ہمیں
شریکِ جلسۂ جشنِ طرب نہیں کرتا

طرح طرح کے تصادم گریزتا گیا میں
نمٹتا کیسے سفر گر یہ سب نہیں کرتا

مخالفت کیا کرتا تھا جنگ کی میں بہت
عدو سے تنگ ہوں اتنا کہ اب نہیں کرتا

وہ حد سے بڑھتا چلا جا رہا تھا جس صورت
خموش میں بھی جو رہتا غضب نہیں کرتا

سخن میں ہی نہیں عالیؔ کی راہ سب سے جدا
کوئی بھی کام زمانے کے ڈھب نہیں کرتا

جلیل عالی

غزل

جما کے رقص کیا تالیاں بجا لی ہیں
ہنوز قہقہے اپنے خوشی سے خالی ہیں

ابھی لبوں پہ سفر کی دعا نہیں آئی
بھنور کو ناپ لیا کشتیاں بنا لی ہیں

اے سدِ راہ پہ خیمہ زنو تمہارے لئے
وفورِ شوق نے راہیں نئی نکالی ہیں

ہماری راہ میں لشکر بٹھا دیے اس نے
مگر یہ ریت کی دیواریں گرنے والی ہیں

تمام مہر بہ لب چیخنے لگے ہیں سنو
جنوں نے صبر کی پابندیاں اٹھا لی ہیں

بپھرتی لہروں کے غیض و غضب سے کیا ڈرنا
کنارِ آب اگر بستیاں بسا لی ہیں

کسی نے روک دیا در بہ در بھٹکنے سے
ہم اپنے در پہ کھڑے ہیں مگر سوالی ہیں

امیرِ شہر سے اپنا خزانہ کم تو نہیں
جنابِ فیض ہیں غالب ہیں اور حالی ہیں

گریباں چاک کریں گے سخنوروں کا کنور
ابھی تو ہم نے فقط گالیاں نکالی ہیں

اعجاز کنور راجہ

غزل

سید ریاض حسین زیدی

جکڑ رکھا ہے بے جا مخمصوں نے
ہمیں مارا ہمارے وسوسوں نے

تماشے پر تماشا ہو رہا ہے
یہ لنکا ڈھائی گھر کے بھیدیوں نے

ہدف بھی نارسا ہوتا گیا ہے
قدم روکے ہیں کھوٹی نیتوں نے

کیا پختہ مکانوں کو برادا
مہیب آسا پہاڑی پتھروں نے

بہت روندے گئے کچے گھروندے
غضب ڈھایا مسلسل بارشوں نے

شکستوں پر شکستیں آ رہی ہیں
ڈبویا ہم کو اوچھی حرکتوں نے

غزلیں

آنکھ کھلتی ہی نہیں عمر بسر ہونے تک
پردہ ہی رہتا ہے دیوار کے در ہونے تک

اُس کی باتوں کو سنا اَن سنا کیجے کیونکہ
زہر بھی زہر نہیں ہوتا اثر ہونے تک

منتظر ہم بھی رہے لطف و کرم کے لیکن
ہوئے معدوم تری ایک نظر ہونے تک

لاکھ حائل ہو کوئی سایۂ دیوار مگر
چلنا ہی پڑتا ہے انجامِ سفر ہونے تک

اپنا احوال تہہِ شیشہ و ساغر ہی رہا
ہم نہ باقی رہے ساقی کو خبر ہونے تک

پُرسکوں رہیے گا ہنگامِ جہاں میں خاور
بیج پر کیا نہ گزرتی ہے شجر ہونے تک

خاور اعجاز

اَب تو باقی رہا کچھ کیف نہ کم آنکھوں میں
آن ٹھہرا ہُوا ہے اپنا تو دم آنکھوں میں

اُس کی جانب سے بھی آنکھوں میں جواب آتا ہے
کہہ گزرتے ہیں کوئی بات جو ہم آنکھوں میں

وصل کے ایک ہی جھونکے میں ہُوا ناپیدا
عرصۂ ہجر میں رہتا تھا جو نم آنکھوں میں

اَب پڑا رہتا ہے یاں گرد و غبارِ دُنیا
کبھی رہتا تھا ترا باغِ ارم آنکھوں میں

لے کے آتا ہے لہو رنگ جواہر خاور
دل کے دریا سے اُمڈتا ہے جو غم آنکھوں میں

غزل

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
ملا بھی کچھ تو بجز داغِ آرزو نہ ملا

وہ میرا رختِ مسافت وہ میرا خوابِ سفر
سراب تھا یا حقیقت جو چار سُو نہ ملا

وہ میرے حال میں رہتا اگر شریک تو کیا
سفیرِ جاں تو رہا، وقتِ جستجو نہ ملا

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس بہانے سے
دیارِ عشق میں اپنا کوئی عدو نہ ملا

میں اپنے حال میں افسر رہا تنِ تنہا
جہانِ دل میں کوئی باغِ رنگ و بو نہ ملا

سید افسر ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نئی گھڑی، نئے صحرا، نئے اُفق لائی
کسی طرح حقِ آشفتگی ادا بھی تو ہو

غزل

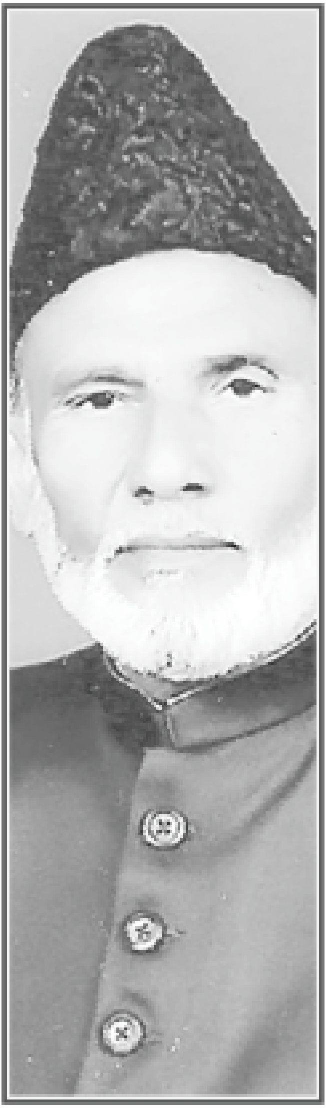

شریف ساجد

دیکھ با دیدۂ وا ، مہر بہ لب آخرِ شب
مستی و کیف جو ڈھاتے ہیں غضب آخرِ شب

ذات پاکش متجلی ز جمال رخ تو
خیرہ ہو جاتی ہے تب چشمِ طلب آخرِ شب

دیدنی عالمِ وارفتگیء دل ہو گا
کھینچ کے لائے اسے بنتِ عنب آخرِ شب

منتیں کی تھیں کہ رک جاؤ ذرا جانِ جہاں
بادو باراں ہی بنے حسن سبب آخرِ شب

حسن تو خود ہی تھا مائل بہ کرم قسمت سے
لے کے ڈوبا ہے ہمیں پاس ادب آخرِ شب

ہمہ شب اشک رواں دارم و گویم ذی شاں
داغ عصیاں مرے دھو ڈالیے سب آخرِ شب

اس کی دزدیدہ نگاہی پہ میں قرباں ساجدؔ
محفلِ غیر بنی بزمِ طرب آخرِ شب

غزل

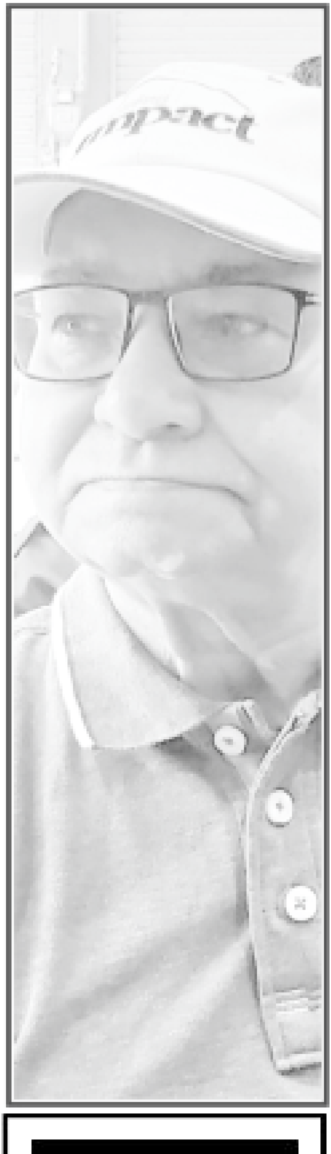

تجسس کھو چکی ہے یہ کہانی
کہانی ہو گئی ہے اب پرانی

یہ آئینہ نہیں تصویر میری
دکھاتا کیوں نہیں میری جوانی

مری تصویر میرے ذہن میں ہے
کبھی جو وقت نے میرے نہ مانی

مجھے اک مسکراہٹ بس عطا ہو
اے میرے یار، میرے یار جانی

مرے ہاتھوں میں تھا مشروب سادہ
ہوا نظروں سے تیری ارغوانی

خیال و خواب ہے دیدار تیرا
جھلک دکھلا کبھی خوابوں کی رانی

سندرتا کو بڑھاوا دے رہے ہیں
چنریا لال، لہنگا تیرا دھانی

تری ہر بات میں نے مانی اجملؔ
کبھی تو نے بھی میری بات مانی

اجمل اعجاز

غزل

گلزار بخاری

لگتا ہے دیکھ کر ترے نقش و نگار کو
قدرت نے کر دیا ہے مجسم بہار کو

قربان ہو چکا ہے کئی بار حُسن پر
ملتی ہے داد اس لیے آئینہ دار کو

جن کے لیے عدم تری دوری کا نام ہے
کہتے ہیں زندگی ترے قرب و جوار کو

دستک محبتوں کی ہو در کھولتے نہیں
پھر ساری عمر ڈھونڈتے رہتے ہیں یار کو

جنت کے صبح و شام تصور میں آ گئے
بخشے وہ رنگ عشق نے لیل و نہار کو

ابلیس زادگان کو شاید خبر نہیں
بھائے صفت وکیل کی پروردگار کو

بنتا ہے آس کتنے مریضوں کے واسطے
بخشی گئی ہے کیسی سعادت انار کو

کلیوں کی آبرو کا محافظ بنائے کون
گلزار داد پھول کو دو گے یا خار کو

غزلیں

سامنے والا کوئی منظر کھو دیں گے
ہنستے ہنستے ہم بھی اِک دن رو دیں گے

ایک سہانی شام کے بے گھر ہونے پر
جھلمل جھلمل پلکیں آپ بھگو دیں گے

دیکھیں گے تعبیر کی حسرت، حیرت سے
مٹی میں کچھ خواب سہانے بو دیں گے

ارمانوں کے درد بسا کر آنکھوں میں
مالا میں کچھ تازہ اشک پرو دیں گے

نسلیں جن کو کاٹیں گی تا عمر یہاں
کیا معلوم تھا ایسی فصلیں بو دیں گے

پھر لہروں میں سوگ بپا ہو جائے گا
کھیون ہار ہی اِک دن ناؤ ڈبو دیں گے

نثار ترابی

ہوئے ہیں فکر و عمل جب سے رہ گزار میں گم
ہماری نسل کا ہر خواب ہے غبار میں گم

وہاں سراغِ صبا کا ملے تو کیسے ملے
جہاں عروجِ سحر بھی ہو تار تار میں گم

کھلا نہیں گلِ تازہ کا پیرہن اب تک
سو بے قراری رہے گی ابھی قرار میں گم

ابھی مسافتِ بے نام ہے پڑاؤ میں
ابھی ستارہ تو خود ہے کسی مدار میں گم

گلوں کا چاکِ گریباں بھی سل ہی جائے گا
ہے فصلِ گُل کا زمانہ ابھی فشار میں گم

ہر اک فضا میں مہکتے ہیں یاسمین و سمن
کہاں ہوئی کبھی خوشبو کسی بہار میں گم

غزل

تلے چراغ کے پھیلا ہوا اندھیرا ہے
نظر سے دور کہیں روشنی کا ڈیرہ ہے

پڑی ہوئی ہے انہیں دو دو ہاتھ کرنے کی
اسی لیے تو مجھے دوستوں نے گھیرا ہے

پھر اس کا بھید مری آستیں نے کھول دیا
میں جس کو سانپ سمجھتا تھا وہ سپیرا ہے

بلائے جان بھی مہمان بن کے آتے ہیں
ہمارا گھر کسی آسیب کا بسیرا ہے

کبھی یہ چاند ستارے زمیں کی رونق تھے
یہ آسمان بھی کتنا بڑا لٹیرا ہے

ہم اس کے سائے میں بیٹھے تو بوڑھے برگد نے
ہمارے سر پہ محبت سے ہاتھ پھیرا ہے

تم اس چراغ کے جلنے سے خار کھاتے ہو
وہ جس چراغ کی لو میں کہیں سویرا ہے

گرنہ کب کی مجھے عقل آ گئی ہوتی
مرے جنون سراسر قصور تیرا ہے

شکاریوں کے لیے بھی سرائے عبرت ہے
یہ مچھلیاں تو نہیں جال میں مچھیرا ہے

مسعود احمد

غزل

دکھ اٹھانے کی ہمیں توفیق ارزانی ہوئی
شکر ہے کہ زندگی میں کچھ تو آسانی ہوئی

میں نہ کہتا تھا بڑھے گا رنجشِ دل کا غبار
بات بن پائے گی کیا گر بات طولانی ہوئی

کون ایسے میں کنارے ڈھونڈھتا پھرتا وہاں
پانیوں کے شہر میں ہر ایک شے پانی ہوئی

ہجر کی شب میں نے شاید پہلے بھی دیکھا تجھے
لگ رہی ہے تو مجھے کچھ جانی پہچانی ہوئی

راہ چلتے اتفاقاً مل گیا تو ٹھیک ہے
ہم نے اس سے ملنے کی منت نہیں مانی ہوئی

سامنے جنگل تھا، جنگل میں کوئی رستہ نہ تھا
جب میں دریا پار اترا تو پریشانی ہوئی

بھیگی پلکوں کا دلِ رنجور پہ کیا اختیار
ساحلوں سے کب سمندر کی نگہبانی ہوئی

کم نگاہوں کے گھروں میں بھی انہیں دیکھا گیا
آئنوں کی شہر میں ایسی فراوانی ہوئی

جو تمہارے ساتھ رہنے سے نہ ہوتی تھی مجھے
اور کیا ہونا تھا بس تھوڑی پریشانی ہوئی

چھت پہ جب تک تھی تو اپنی اپنی لگتی تھی مجھے
دھوپ آنگن میں اتر آئی تو بیگانی ہوئی

طالب انصاری

غزل

دن سے اور رات سے نکل گئے ہیں
اب ترے ہات سے نکل گئے ہیں

اپنے حصے کا بُن دیا ریشم
پیڑ سے، پات سے نکل گئے ہیں

تنگ ہم پر زمین کر دی تھی
لے، سماوات سے نکل گئے ہیں

دیکھ لیجے، کہیں یہ ہم تو نہیں
ہم جو اوقات سے نکل گئے ہیں

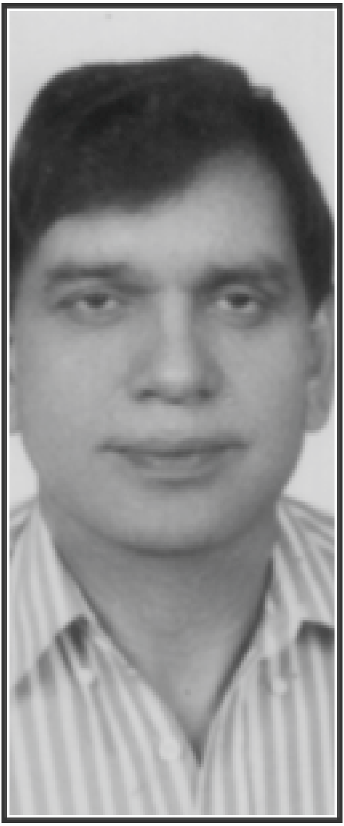

اب کسی ذکر میں نہیں ہیں دوست
اب ہر اک بات سے نکل گئے ہیں

اتنے روشن تھے خواب شہروں کے
لوگ دیہات سے نکل گئے ہیں

فیصلہ حق میں، یا مخالف ہو
جیت سے، مات سے نکل گئے ہیں

کائناتوں کے راز کھول دیے
سب سوالات سے نکل گئے ہیں

تیری کشتی بخیر، لیکن ہم
سیلِ حالات سے نکل گئے ہیں

خاک سے گفتگو چھڑی ہوئی ہے
صورت و ذات سے نکل گئے ہیں

قیوم طاہر

غزل

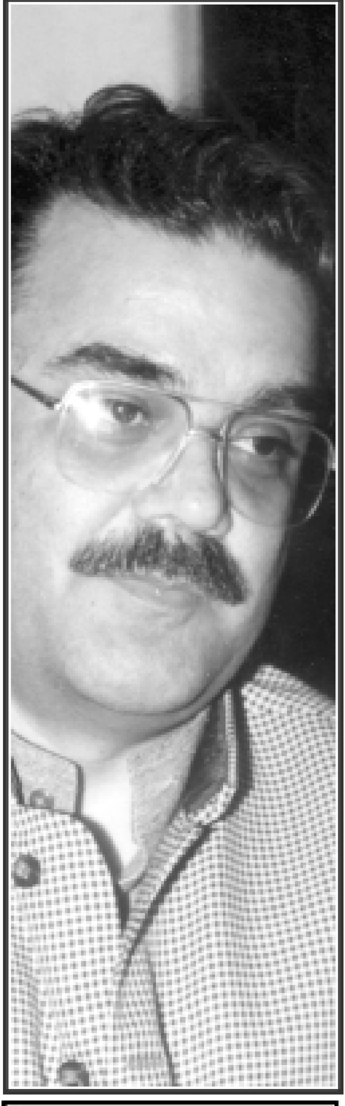

اشک پھر آنکھوں میں ہیں شاید محرم آ گیا
یا عدم آباد سے واپس ترا غم آ گیا

سر ہتھیلی پہ لیے نکلے ہیں پھر کچھ قافلے
پھر عوام الناس کے مرنے کا موسم آ گیا

قوت بازو نہیں، پر شوق تبدیلی کا ہے
پوچھتا پھرتا ہوں میں، کیا ابن مریم آ گیا

راہِ حق دشوار تھی بے حد، سو میں بیٹھا رہا
جان دی تو نے، مرے حصے میں ماتم آ گیا

رزم سے باہر بہائے خون کے آنسو بہت
اس لہو سے بازوئے قاتل میں دم خم آ گیا

میری اور تیری کروڑوں پرچموں کو پھاڑ کر
پھر کوئی غاصب اٹھائے سبز پرچم آ گیا

آخرِ شب کیوں کھٹکتی ہے میری زنجیرِ در
جا کے دیکھوں زہر آیا ہے کہ مرہم آ گیا

شاہنواز زیدی

غزل

جو ملا بھی نہیں مجھ کو ابھی کھویا بھی نہیں
پھر بھی اک خواب ہے آنکھوں میں کہ سویا بھی نہیں

اپنے سورج سے بچھڑنے کی نشانی تو رہے
داغ سینے کا جبھی چاند نے دھویا بھی نہیں

آہٹیں اس کی ہیں رقصاں مری شریانوں میں
میں نے جو درد ابھی دل میں سمویا بھی نہیں

ایک مدت سے کنارے بھی خفا ہیں مجھ سے
جس بھنور میں ہوں مجھے اس نے ڈبویا بھی نہیں

جانے زخموں کی اُگی فصل وہ کیسے مجھ میں
میں نے جس کو ابھی کاٹا نہیں بویا بھی نہیں

نارسائی نہ کیوں اس کی دعاؤں کا نصیب
جس نے دامن کبھی اشکوں سے بھگویا بھی نہیں

لمس اس پھول بدن کا رگ و پے میں ہے جلیلؔ
ہار بانہوں کا ابھی اس نے پرویا بھی نہیں

احمد جلیل

غزل

دیکھ کر شامِ غریباں نہ رُکا شام کے ساتھ
چاند، سورج کی طرح ڈوب گیا شام کے ساتھ

روشنی جلتے ہوئے خیموں کی آتی ہے نظر
ہم جلاتے نہیں آنگن میں دیا شام کے ساتھ

رات کیسے میں گزاروں گا اسی سوچ کے بعد
ڈوبنے لگتا ہے دل روز مرا شام کے ساتھ

چند لمحوں میں ہی اَب دن ہے بچھڑنے والا
مانگ لو آج جُدائی کی دُعا شام کے ساتھ

اشک چھُریوں کی طرح چہرے پہ لگتے ہی رہے
روز بجتی رہے ماتم کی فضا شام کے ساتھ

کربلا، کوفہ، نجف سب کی زیارت ہے اہم
درد کا ایک تعلق ہے جُدا شام کے ساتھ

رنگ پھر سارے یزیدوں کے اُڑے چہروں سے
خطبہ، بنتِ علیؑ جب سے جُڑا شام کے ساتھ

اَب بھی دل چیرتی ہے وقت کے سناٹے کا
قید خانے سے سکینہؑ کی صدا شام کے ساتھ

برف زاروں میں سنبھل کر ہی قدم رکھتا ہوں
یہاں چل پڑتی ہے برفیلی ہوا شام کے ساتھ

ظلم اور صبر کی اس جنگ کا انجام عقیل
دیکھنے عرش سے خود اُترا خُدا شام کے ساتھ

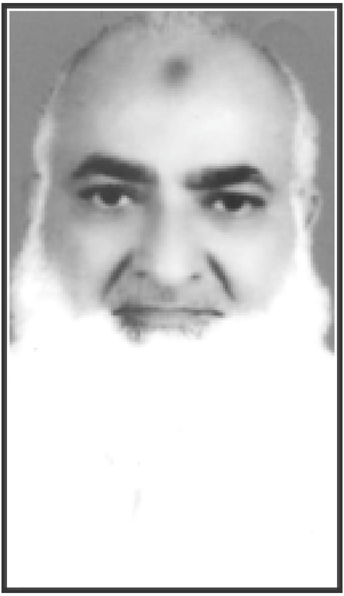

عقیل رحمانی

غزل

تمہارا استعارا آنکھ میں ہے
جہاں سارے کا سارا آنکھ میں ہے

جہاں دو دل محبت سے ملے تھے
وہ منظر وہ نظارہ آنکھ میں ہے

نظر کی وسعتوں سے دل کی حد تک
تمہارا ہر اشارہ آنکھ میں ہے

جہاں میرے سہارے چھن گئے تھے
وہ صحرا بے سہارا آنکھ میں ہے

تمہارے وصل کے لمحے سے اب تک
تمہارا قُرب سارا آنکھ میں ہے

محبت کے حسیں خوابوں کے بدلے
یہ کس غم کا اشارہ آنکھ میں ہے

مرے اشکِ رواں یہ کہہ رہے ہیں
کہ موجِ بے کنارہ آنکھ میں ہے

اداسی کے دیے ہمراہ لے کر
شبِ فرقت کا تارہ آنکھ میں ہے

وہ جو خاموش ہو تو آنکھ بولے
سخن سارے کا سارا آنکھ میں ہے

جہاں پر تم بچھڑ کر مل نہ پائے
وہ شامِ بے نظارہ آنکھ میں ہے

تمہی ہو دل، تمہی ہو جانِ افروزؔ
طلب کا گوشوارا آنکھ میں ہے

افروز رضوی

غزل

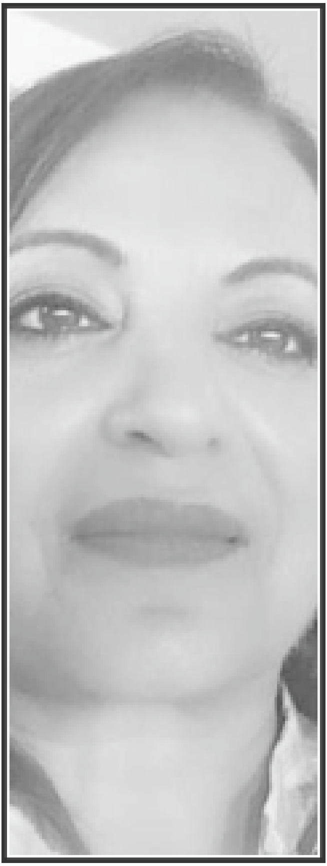

ضد باندھی ہے دل نے، پر پابندی ہے
جانِ من! تجھے ملنے پر پابندی ہے

کچھ اشعار کی پنکھڑیاں بھیجوں تجھ کو
پھولوں کے لب کھلنے پر پابندی ہے

دیکھنے کو تجھے یک دم آنکھیں تڑپ اُٹھیں
جب سے سنا تجھے ملنے پر پابندی ہے

ہم اشجار نہیں ہیں لیکن کچھ دن سے
اپنی جگہوں سے ہلنے پر پابندی ہے

جب تک دعا نہ پہنچے نیلی چھتری تک
کریں دعا، لب سلنے پر پابندی ہے

اک ناسور میں ڈھل جانا جس کا انجام
ایسے زخم کے چھلنے پر پابندی ہے

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نظر نظر میں ہزاروں سوال ہیں لیکن
فلک سے کوئی مری سمت دیکھتا بھی تو ہو

غزل

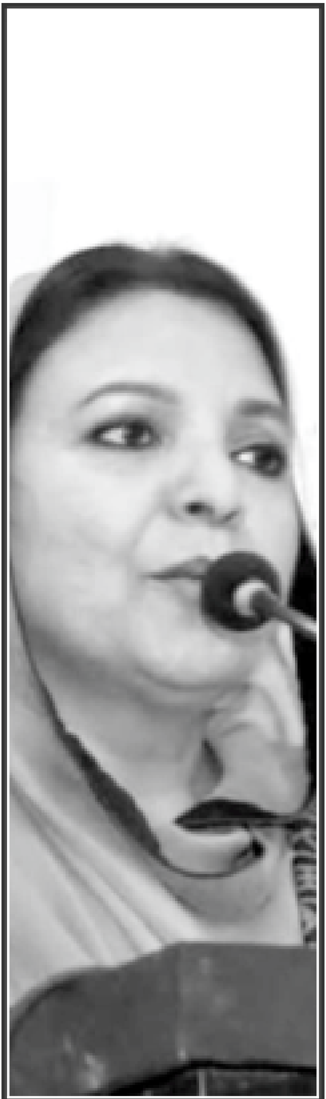

اک عمرِ ریاضت کا ثمر داغِ محبت
مٹ جائے گا ہر رنگ مگر داغِ محبت

لو دیتے ہیں مانندِ قمر داغِ محبت
دیتے ہیں مرے غم کی خبر داغِ محبت

ہیں سوختہ جاں آج ترے ظلم گزیدہ
دل زخمِ فروزاں تو جگر داغِ محبت

ہر شام کے ماتھے پہ چمکتا ہے مہِ غم
زندانِ وفا رات ، سحر داغِ محبت

ایوانِ دل و جاں میں تمغوں کی طرح سے
رکھے ہیں بہ چشم اور بہ سر داغِ محبت

پیہم ہے جواں آنکھ میں اشکوں کی روانی
رہتے ہیں سدا محوِ سفر داغِ محبت

جب اشک بہاتے ہیں یہ بادل بھی مرے ساتھ
ایسے میں سلگ اٹھتا ہے ہر داغِ محبت

خالدہ انور

غزل

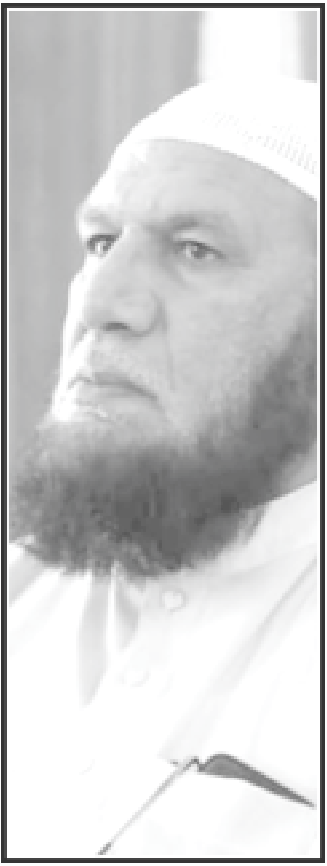

عشق باقی ہے نہ اب عشق تماشا باقی
ترے دیدار کی ہے ایک تمنا باقی

عکس آنکھوں میں جو تھے وقت نے برباد کیے
رہ گیا ایک تری یاد کا تحفہ باقی

وحشتِ مہر سے ہی چھپ گئے راتوں کے نگیں
پہلوئے صبح میں ہے ایک ستارا باقی

بعد تیرے مرے سارے ہی کھلونے ٹوٹے
دل کی الماری میں ہے پیار کی گڑیا باقی

ہم نے یہ سوچ کے سامانِ سفر باندھ لیا
عمر تو بیت گئی وقت ہے تھوڑا باقی

اک کہانی تھی محبت کی رضاؔ ختم ہوئی
اب نہ کردار ہی باقی ہے نہ قصہ باقی

رضا اللہ حیدر

کوئی بات کو بات نہ جانے
کوئی بال کی کھال اُدھیڑے

انتخاب
خالد احمد
نعمان منظور

غزل

ہر لحظہ تری یاد ہے، صحرا ہے، جنوں ہے
اس دل کے مقدر میں اماں ہے نہ سکوں ہے

پھر کوچۂ دل دار کی جانب ہوں روانہ
پھر آتشِ جاں سوز، مرا سوزِ دروں ہے

ہو سامری وقت کا جیسے کہ تسلط
دنیائے شب و روز پہ طاری وہ فسوں ہے

اک خانۂ ویراں ہے مرے دل کا مکاں بھی
اس کی بھی فصیلیں ہیں نہ چھت ہے نہ ستوں ہے

اجڑے ہیں تو اب یاد بہت آئے، وہی لوگ
جو عشقِ بلا خیز کو کہتے تھے کہ "یوں" ہے

سوچیں تو محبت ہی نہیں باقی جہاں میں
دیکھیں تو سفید اب کے یہاں رنگتِ خوں ہے

حالات دگرگوں ہیں نقیبِ سرِ محشر
شوکت! یہ جہاں منتظرِ "کن فیکوں" ہے

شوکت محمود شوکت

غزل

دریا چھلکتا جاتا ہے کرنوں کے جال سے
روشن ہے بادبان بھی صبحِ جمال سے

ایسا دیا جواب اُسے میں نے ایک دن
نکلا نہیں وہ آج بھی اپنے سوال سے

شدت سے یاد آنے لگا مجھ کو میرا گھر
پتا گرا ہے جب بھی کوئی سوکھی ڈال سے

اندر کوئی فقیر سا آتا ہے وجد میں
پھر اُس کے بعد جی نہیں بھرتا دھمال سے

اے میرے کوزہ گر مجھے رہنے دے چاک پر
میں اور ٹوٹ جاؤں گا اس دیکھ بھال سے

سرفراز تبسم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مری بات کہتے رہنا ، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علم فرو نہ کرنا ، یہ فلک سجائے رکھنا

غزل

ثمینہ سیّد

ہار ہوتی رہی ہر بار ، ثمینہ سید
لوگ اٹھاتے رہے دیوار ، ثمینہ سید

جو لگاتے ہیں لگانے دیں قلم کی قیمت
اپنا حتمی وہی انکار ، ثمینہ سید

جرم جن کے ہیں عیاں سارے زمانے بھر میں
خود لگا بیٹھے ہیں دربار ، ثمینہ سید

میل کھاتی نہیں اعمال سے ان کی قسمیں
کیا سدھرنے کے ہیں آثار ، ثمینہ سید؟

فاصلے عشق میں حائل تو نہیں ہو سکتے
اس طرف میں ہوں وہ اس پار ثمینہ سید

جس سے غیرت بھری تلوار نہیں اٹھتی ہے
وہ قبیلے کا ہے سردار ، ثمینہ سید

کر لیا ذات کے حجرے میں مقید خود کو
جب سے دنیا لگی بازار ، ثمینہ سید

جن کا مقصد ہے مقابل کو اپاہج کرنا
دیکھتے ہیں مری رفتار ، ثمینہ سید

ایک بس اس کی ہی رحمت پہ یقیں ہے ورنہ
ویسے میں ہوں تو خطاکار ، ثمینہ سید

غزل

اِک دل ربا جو میری کہانی میں آ گیا
رنگِ شباب ڈھلتی جوانی میں آ گیا

اَبرِ کرم وفاؤں کا برسا جو ٹوٹ کر
دریا محبتوں کا روانی میں آ گیا

موسم جو دل کا راس نہ آیا تو ایک دن
وہ شخص میری آنکھ کے پانی میں آ گیا

اب مُڑ کے دیکھنا بھی گوارا نہیں اُسے
ایسا غرور یوسفِ ثانی میں آ گیا

اے حُسن تیری چاہ میں جنّت کو چھوڑ کر
ذوقِ وصال گلشنِ فانی میں آ گیا

دامن میں اُس کے بھر دیا میں نے سحر کا نور
سائل جو بزمِ حاتمِ ثانی میں آ گیا

اکرم سحر فارانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گوہرِ معنی کہاں؟ تُو کس لیے خالد
بحرِ سخن لہر لہر چھان رہا ہے

غزل

گمشدہ دریاؤں کے ماتم میں اڑتی ریت کو
بارشوں کا پرسہ دو حرفِ تسلّی تو کہو

کون سہہ سکتا تھا ایسے حسنِ بے پایاں کی آب
ایک بوسہ آئینے کو، ایک بوسہ خود کو دو

صبح دم مہندی کے پھولوں کی مہکتی شاعری
باغ کی دیوار سے لپٹی ہوئی ہے، سانس لو

میں تمہیں اچھا لگوں گا تم کو کھو دینے کے بعد
تم ابھی اچھے دنوں کی یاد میں مصروف ہو

یہ جو دکھتا ہے مری آنکھوں میں دھندلا سا تمہیں
تم اسے نزدیک کی عینک سے شاید پڑھ سکو

دیکھ کے اک دوسرے کو سب بھلا بیٹھے تھے ہم
میں بھی جاتا ہوں کنارے سے چلو تم بھی بہو

چندیائیں دھوپ میں پھیلانے آ جاتا ہوں میں
ساتھ چلنا ہے تو آؤ ایک سے اچھے ہیں دو

دامنِ دریا کی درویشی کا اندازہ کرو
چِٹھیو، تصویرو، بوسیدہ سپارو، بوتلو

وقت اور دریا کی قسمت میں نہیں الٹا بہاؤ
تم تو آ سکتے ہو واپس، تم تو کچھ کوشش کرو

گھر سے ماؤں کی دعا لے کر نکلتے ہیں میاں
آخری اسپیس اسٹیشن کے سگنل میں رہو

منظر اعجاز منظر

غزل

گو مشکل ہے لیکن ایسا ہو سکتا ہے
محفل میں بھی کوئی تنہا ہو سکتا ہے

یہ جو وصل کی خواہش ہے کیا پیاس نہیں ہے؟
بہتا دریا بھی تو پیاسا ہو سکتا ہے

پیاس بجھاتی لہریں پیاسی ہو سکتی ہیں
دریا کے دامن میں صحرا ہو سکتا ہے

وہ جو بل کھاتا رستہ ہے دور زمیں پر
اپنے وقت کا کوئی دریا ہو سکتا ہے

دور اُفق پر اڑتے پنچھی دیکھ رہے ہو؟
دور وہیں صحرا میں چشمہ ہو سکتا ہے

ایک گھنا جنگل ہے سامنے اپنے
لیکن جنگل میں بھی رستہ ہو سکتا ہے

جھیلوں سی آنکھوں والی دیوانی لڑکی
آنکھوں کا دیکھا بھی دھوکا ہو سکتا ہے

بوسیدہ کپڑوں میں شاہ بھی ہو سکتے ہیں
پھٹا ہوا یوسف کا کرتہ ہو سکتا ہے

پوچھ سکو تو مجھ سے کسی عاشق سے پوچھو
کوئی عشق میں کتنا رسوا ہو سکتا ہے

ساری ساری رات نہیں جو سونے دیتا
شاید کوئی دل کا خدشہ ہو سکتا ہے

دیکھ رہا ہوں دشمن کو اور سوچ رہا ہوں
میرا دشمن کیسے میرا ہو سکتا ہے

قصہ گو جو آج سنائے میرا قصہ
اس پر اچھا خاصا گریہ ہو سکتا ہے

بیٹھے بیٹھے یوں جو زخم کرید رہے ہو
ایسے تو یہ گھاؤ گہرا ہو سکتا ہے

علمدار حسین

غزل

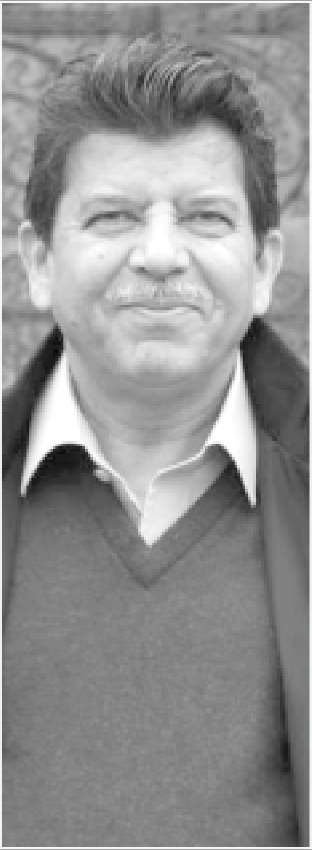

راجہ عبدالقیوم

ہم نے تمہارے پانے کو کیا کیا نہیں کیا
اور تم لے آزمانے کو کیا کیا نہیں کیا

لیکن کہاں تھا ساتھ تمہارا نصیب میں
ہم نے اسے بنانے کو کیا کیا نہیں کیا

ویرانیاں جو چاروں طرف سے اُمڈ پڑیں
ہم نے بھی گھر سجانے کو کیا کیا نہیں کیا

کس شد و مد سے یاد وہ آتا رہا ہمیں
ہم نے اسے بھلانے کو کیا کیا نہیں کیا

کیا کیا نہ سوچا تیری مسرت کے واسطے
اور تُو نے دل دکھانے کو کیا کیا نہیں کیا

کیسی روا روی میں کٹی عمر بے ثمر
ہم نے اسے لٹانے کو کیا کیا نہیں کی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خوابِ رواں! ہے تری تعبیر کہاں

غزل

ہم زندگی کے نام پر مرتے رہے یہاں
اس رہگذر پہ جاں سے گزرتے رہے یہاں

وہ تیز آندھیوں کی طرح ہم سفر رہا
ہم خاکِ راہ بن کے بکھرتے رہے یہاں

جتنا ڈبویا سیلِ غمِ روزگار نے
ہم لہر لہر ہو کے ابھرتے رہے یہاں

اس چشمِ حیرتی کی توجہ کا شکریہ
ہم صحبتِ جنوں میں نکھرتے رہے یہاں

اس ماہ رُو نے ہم پہ توجہ نہ کی علی
ہم بام پر چراغ ہی دھرتے رہے یہاں

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

غزلیں

ایک جگہ پر ٹھہری سوچ
جیسے گونگی بہری سوچ

میں چاہت کا قائل ہوں
اور تری بے مہری سوچ

دیکھتے ہیں جو دور تلک
رکھتے ہیں وہ گہری سوچ

لہجے میں تو میٹھا پن
اندر ان کے زہری سوچ

کس نے سوچا محشر کو
دیکھی سب کی دہری سوچ

کس کی خاطر رہتی ہے؟
آنکھ میں تیری گہری سوچ

ہم باسی ہیں گاؤں کے
افضل ان کی شہری سوچ

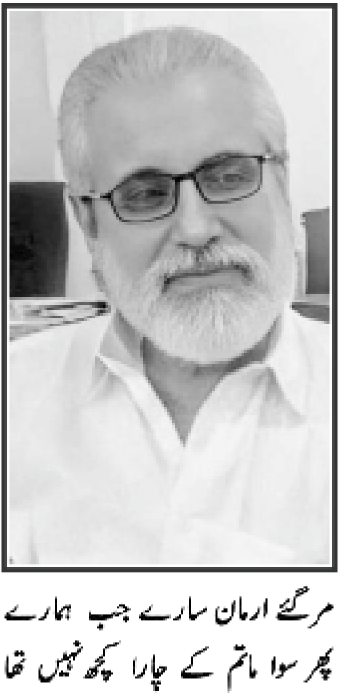

افضل ہزاروی

چاند، سورج اور ستارا کچھ نہیں تھا
سب ضیا اُس کی ہمارا کچھ نہیں تھا

وہ بھی آیا سادگی میں ہم سے ملنے
ہم نے بھی خود کو سنوارا کچھ نہیں تھا

چُھوٹا ماضی حال میں پہنچے تو دیکھا
ہاتھ میں تتلی، غبارا کچھ نہیں تھا

تیری اک مسکان سے بڑھ کر مجھے تو
اور اس دنیا میں پیارا کچھ نہیں تھا

مر گئے ارمان سارے جب ہمارے
پھر سوا ماتم کے چارا کچھ نہیں تھا

دل گیا تھا پیار کی بازی میں افضل
میری خوش فہمی کہ ہارا کچھ نہیں تھا

غزل

غرورِ حسن گیا، ذوقِ آئینہ بھی گیا
وہ خود سے راز و روایت کا سلسلہ بھی گیا

حیات و موت کے معنی سمجھنے والا چراغ
لپک کے مدِ مقابل ہوا کے آ بھی گیا

یہ تیرا ذوقِ سخن ہے بجا، مگر اے دوست
کبھی تو لفظ و معانی کے ماورا بھی گیا؟

مزاج میں ہے وہ گرمی نہ اب وہ حسنِ طلب
جو وقت بدلا تو سب اپنا فلسفہ بھی گیا

سفر کی گرد میں گم صم سی ایک آہٹ سے
ذرا سا دھیان بٹا تھا کہ راستہ بھی گیا

مرے ہی عکس نے یوں مجھ کو کر دیا مسحور
وہ کیف و جذب تھا ہاتھوں سے آئینہ بھی گیا

سفر وہی تھا مگر ہم سفر بدلنے سے
سفر کا شوق مٹا سارا ولولہ بھی گیا

بہا دیا مجھے ان اشک بار آنکھوں نے
قمرؔ اب اپنے کناروں سے رابطہ بھی گیا

اقبال قمر

غزل

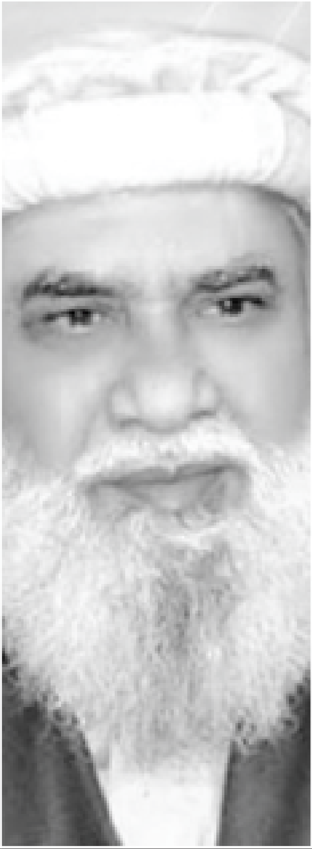

اکرم ناصر

کر دیتا ہوں کر دینے کا وعدہ نہیں کرتا
میں خود پہ یقیں حد سے زیادہ نہیں کرتا

ہوتا نہیں جس کام کی کرتا ہوں تگ و دو
ہو جاتا ہے وہ جس کا ارادہ نہیں کرتا

تدبیر کبھی کی ہے کوئی کرنے کی تو نے
روتا ہے کہ وہ رزق کشادہ نہیں کرتا

رونے کو بہت رو لیا حالات کا رونا
جیون کو مگر اپنے تو سادہ نہیں کرتا

ہر روز کیا کرتا ہوں ایجاد نیا جرم
مجرم ہوں میں جرموں کا اعادہ نہیں کرتا

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

چار سُو پھیل گئے کانچ کے ٹکڑے خالد
حسنِ مفہوم کہاں ، کاہشِ تفسیر کہاں

غزل

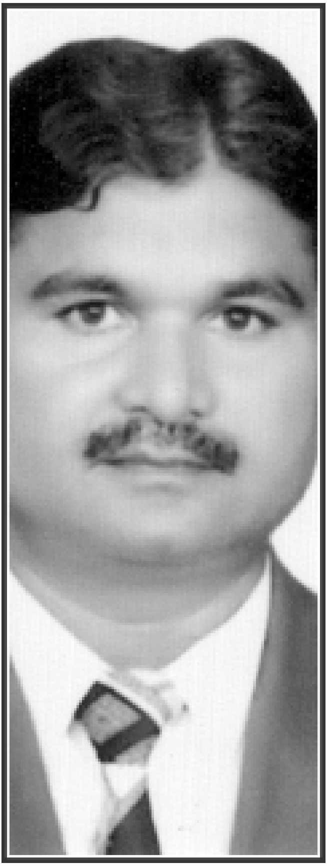

کوشش کے باوجود نہ کھوٹا ، کھرا ہوا
لگتا ہے نامراد ہے جگ سے ڈرا ہوا

سُوکھا پڑا تھا ایک زمانے سے دوستا
دیکھا تجھے تو جسم کا پودا ہرا ہوا

پتھر کسی کی یاد کا رکھا تھا جس جگہ
کہتے ہیں آج بھی ہے وہیں وہ دھرا ہوا

تشنہ لبوں کے حال پہ چھائی ہے مُردنی
مشکوں سے ختم ہو گیا پانی بھرا ہوا

میرا کہا بھی خاک میں تُو نے ملا دیا
تجھ پر مرے کہے کا اثر نہ ذرا ہوا

زندوں میں کر شمار نہ میرے وجود کو
میں ہوں کسی کے عشق میں انصرؔ مرا ہوا

انصر حسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزل

آسمانِ غم پہ کُرلاتا رہے
کونج کی مانند جو بھٹکا رہے

بیتے لمحوں کی سنہری ریت سے
سیپیاں وہ یاد کی چنتا رہے

بند ساری کھڑکیاں رکھتا ہے وہ
اپنی دنیا میں سدا تنہا رہے

جھڑتے پتوں سے ہے کیا نسبت اُسے
سارا دن پیڑوں تلے پھرتا رہے

روشنی کی کھوج میں جگنو کے ساتھ
ساری ساری رات وہ اُڑتا رہے

آ کے لہریں گفتگو کرتی رہیں
بیٹھ کر ساحل پہ وہ سنتا رہے

غم کی گرمائش سے دل کا برف زار
قطرہ قطرہ آنکھ سے بہتا رہے

آنکھ رکھ کر گھر کی چوکھٹ پر کوئی
جانے کس کا راستہ تکتا رہے

ایک ہی رستے پہ ساری زندگی
وہ کوئی دریا ہے جو چلتا رہے

بس میں ہو روشنؔ تو اُس کی یاد میں
تُو بھی غالب کی طرح بیٹھا رہے

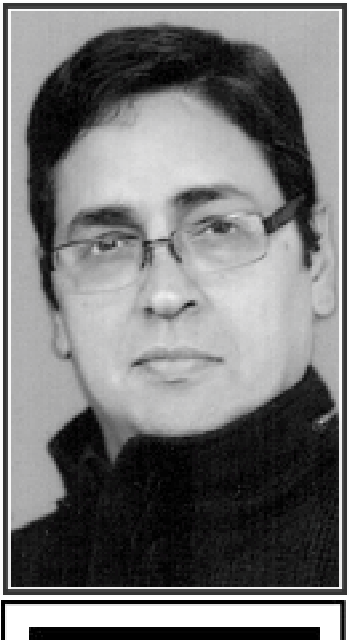

اعجاز روشن

غزل

کوئی راگ گھروندہ ٹوٹا مدھم من کے اندر
چنچل زخم کی مایا مہکے بھیگے بن کے اندر

میں بھی تھپ کنارے کھڑکی کھولے آگ بناؤں
وہ بھی راکھ اگائے اپنے سوکھے تن کے اندر

کیا خاموشی گاتا جائے آوازوں کا پنچھی
اپنے پیلے پنکھ جلائے سرخ گگن کے اندر

سارا پربت بیٹھی بیٹھی غار کی جھولی جھولے
اور ستارے کوٹے کوئی درد چبھن کے اندر

روپ کا صندل اونگھ رہا تھا دھرتی پر سر رکھے
دھانی رنگ کی پائل بُو کر رات پون کے اندر

کس کی تھالی کھوج رہی ہے جی مندر کی سیڑھی
جلتی ارتھی گھوم رہی ہے بانجھ بھجن کے اندر

ایک پیالہ چاک پہ ٹوٹا چھن چھن چھن چھن کرتا
کس بندھن کا دھاگہ روئے سانجھ ملن کے اندر

سارا جیون پھیل چکا تھا کوکھ گپھا کے باہر
اور بنجارا ڈھونڈھ رہا تھا اندھے پن کے اندر

چھکے چھکے بھیگ رہا تھا ڈھولی، ڈھول سمندر
سانول راگ کی تال پہ بکھرا جل ساون کے اندر

ناؤ بڑھی تو ماجھی گیت کا آنچل باندھ رہا تھا
نین بھنور سے نین ملا کر تھے درپن کے اندر

کس کو زخم کتھا سمجھائیں آنکھیں صرف چتائیں
باہر گنگ سیاہی سوئے شور بدن کے اندر

پران گنوا کر بھی برہا کی پیڑ کا پیڑ ہرا تھا
اس کے ہاتھ میں سب ٹکڑے تھے میں تھا چھن کے اندر

سکھیاں جھولے ڈال چکیں پر کون رُدھے سے لوٹے
پریت انیم کنارے چھوٹی سب ساجن کے اندر

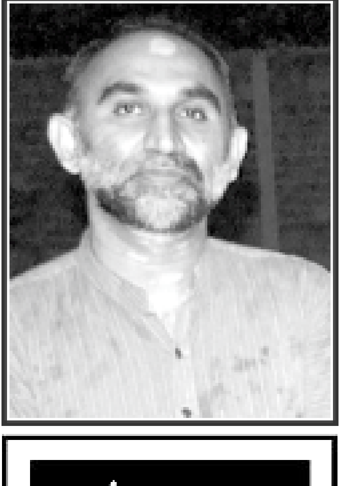

ابو طالب انیم

غزل

زندگی کی ہے ابتدا سجدہ
بندگی کی ہے انتہا سجدہ

جس سے کعبے کو وجد آ جائے
کوئی ایسا بھی کر ادا سجدہ

عار میری جبیں سے دھرتی کو
کیا ہوں میں اور کیا مرا سجدہ

مہر و مہ نے بھی پھر نہیں دیکھا
ایسا شبیرؓ نے کیا سجدہ

ڈھونڈتے ہیں ہنوز دیر و حرم
کہاں ابلیس کا گیا سجدہ

دیکھنے میں تو تھا وہ آدمؑ کو
اصل میں مصطفیٰؐ کو تھا سجدہ

ایک پل کا غرور لے ڈوبا
ہوا بے کار جا بہ جا سجدہ

بحرِ وحدت کا آئنہ قطرہ
اوجِ نسبت کا سلسلہ سجدہ

اُمتوں کی نجات کا ضامن
سرِ محشر حضور کا سجدہ

جو بھی ارض و سما میں ہے فیضانؔ
سب کا پیہم ہے مشغلہ سجدہ

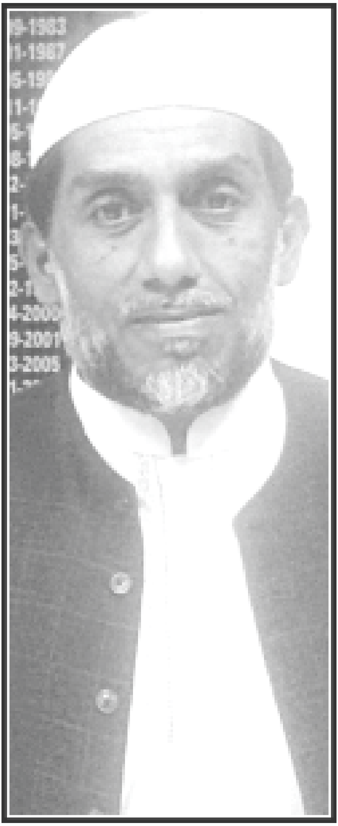

فیض رسول فیضان

غزل

اُسی کی سمت جہاں سنگ لے کے آتا تھا
وہی زمیں پہ جو تازہ مہک اُگاتا تھا

بنا ہوا تھا جہاں اِس لیے مرا دُشمن
مرا یہ جُرم تھا میں آئینہ دِکھاتا تھا

محبتوں میں مری جان وہ بھی دن تھے کبھی
تری جُدائی پہ دل حشر سا اُٹھاتا تھا

بنا ہوا تھا مرے راستے کی وہ دیوار
میں جس کی راہ سے پتھر سدا ہٹاتا تھا

رکھا تھا راہِ محبت پہ جب قدم پہلا
ترے فراق کا موسم بہت جلاتا تھا

غمِ زمانہ پہ ٹھہری ہوئی تھی آنکھ مری
ترا خیال بہت دیر بعد آتا تھا

میں لے کے جاتا تھا ہر بار اُس سے تازہ پھول
میں جس کے واسطے ہر روز پھول لاتا تھا

دِکھائی دیتی نہیں تھی کوئی بھی چیز مجھے
مری نظر سے وہ اِک پَل جو دُور جاتا تھا

دُعائیں لیتا تھا اُس کی تمام رات نبیلؔ
تمام شب وہ مجھے اپنے غم سُناتا تھا

نبیل احمد نبیل

غزل

زندگی بھر یہی ارمان نہیں پورا ہوا
خواب مر جانے کا نقصان نہیں پورا ہوا

ہم تجھے کیسے بتائیں کہ ترے بعد یہاں
زندہ رہنے کا بھی سامان نہیں پورا ہوا

آخرش پورا تو ہونا ہی تھا یہ کارِ وصال
ہاں مگر عشق کے دوران نہیں پورا ہوا

تُو نے لکھ ڈالے ہیں کس طرح فسانے دل کے
میرے جیسوں سے تو عنوان نہیں پورا ہوا

بس یہی سوچ کے مایوس ہوا جاتا ہوں
آئنے کا بھی کوئی مان نہیں پورا ہوا

سید تیمور کاظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ میں نہیں، مرا پَرتَو نہیں، یہ میں تو نہیں
گماں سا کیوں مجھے گزرا؟ کہیں یہ میں تو نہیں

غزل

جاری ہے انحطاط، ابھی طے نہیں ہوا
چلنا ہے کس کے ساتھ، ابھی طے نہیں ہوا

دینے ہیں کس کو پھول، چلانا ہے کس پہ تیر
ہمزاد احتیاط! ابھی طے نہیں ہوا

کرنی ہے اس نے بات کسی ایک شخص سے
کرنی ہے کس سے بات ابھی طے نہیں ہوا

کل مجھ کو بزمِ ناز میں کرنی ہے گفتگو
کیا ہوں گے موضوعات، ابھی طے نہیں ہوا

جیتے گا کون کھیل میں یہ تو ہے طے شدہ
ہونی ہے کس کو مات ابھی طے نہیں ہوا

کہہ تو رہی تھی ساتھ نبھائے گی عمر بھر
ہاتھوں میں دے گی ہاتھ ابھی طے نہیں ہوا

دل کا غزال دام میں آئے گا ایک روز
کب ہو گی واردات، ابھی طے نہیں ہوا

ہونا ہے کس جگہ پہ مرا آخری قیام
باقی ہیں ممکنات، ابھی طے نہیں ہوا

رکھیں گے آصفؔ آج سے ہم مختصر سے دوست
دو، چار، پانچ، سات، ابھی طے نہیں ہوا

آصف شفیع

غزل

اتنے مصروف رہے خود سے ملاقات نہ کی
اتنے مصروف کہ ان سے بھی کوئی بات نہ کی

یہ سمجھ کر ہمیں اندر سے ملے گا گوہر
ذات میں گم تھے تمنائے سماوات نہ کی

جبر کی شکل میں موسم کا تسلسل رکھا
کبھی آندھی نہ چلائی کبھی برسات نہ کی

بندگی سے ہی ملا کرتی ہے رفعت سب کو
اس جبیں نے بھی مگر جنبشِ اثبات نہ کی

ان کو دیکھا، جو گلے یاد تھے، سب بھول گئے
یوں شکایت بھی کوئی وقتِ ملاقات نہ کی

اس کو ملنا تجھے ملنے سے ضروری تھا حبیب
دن گزارا ترے کوچے میں کبھی رات نہ کی

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رگ رگ ایک تصور ایک امنگ بھرے
اک خوشبو پھولوں میں کیا کیا رنگ بھرے

غزل

زمانے کو بھڑکنے دو اگر مجھ سے محبت ہے
دلوں میں آگ جلنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

گماں میرا سہارا ہے اسے مجھ سے نہ تم چھینو
مجھے خوابوں میں رہنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

تمہارے ساتھ جینا ہے، تمہارے ساتھ ہے مرنا
زباں سے اب تو کہنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

محبت ضد نہیں ہوتی، نہ کوئی کھیل ہوتی ہے
مجھے تھوڑا سنبھلنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

محبت میں کوئی وعدہ، کوئی دعویٰ نہیں ہوتا
مجھے بس خود پہ مرنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

مجھے ہر بات کہتی ہے تمہاری آنکھ کی شوخی
مجھے پلکوں پہ لکھنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

نہ مجھ سے دور تم جاؤ، نہ مجھ کو دور جانے دو
مجھے بس مجھ میں رہنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

تمہارا درد لے لوں میں، تمہیں خوشبو ہی خوشبو دوں
مجھے کانٹوں پہ چلنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

مجھے اپنی نگاہوں میں کوئی رستہ دکھانے دو
مجھے دل میں اترنے دو اگر مجھ سے محبت ہے

جو لہجہ تلخ لگتا ہے وہی جبرانؔ ہے سچا
ذرا سا سچ بھی سننے دو اگر مجھ سے محبت ہے

وسیم جبران

غزل

میرے اشعار میں رونق مری تنہائی سے ہے
غم کو سہنے کی سکت، غم کی شناسائی سے ہے

تو کہیں بھی نہیں موجود مگر دل میرا
اب بھی آباد تری حوصلہ افزائی سے ہے

ٹوٹتے ٹوٹتے یکجا بھی تو ہو جاتے ہیں لوگ
یہ کرشمہ بھی محبت کی توانائی سے ہے

تجربہ چاہے لسانی ہو کہ جدت کا فروغ
شعر کا حسن مگر لفظ کی گہرائی سے ہے

میں تصوف کی ظہورؔ ایسی منازل پر ہوں
پارسائی کا تعلق جہاں رسوائی سے ہے

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جی سے چاہا تھا اگر مر نہ سکوں، زندہ رہوں
ڈوب مرنے نہ دیا، پار اُترنے نہ دیا

غزل

اچھا تھا اپنا حال ابھی کل کی بات ہے
ہر شخص تھا مثال ابھی کل کی بات ہے

بوڑھے کھڑے ہیں نوجواں بیٹھے ہیں سیٹ پر
ایسا نہیں تھا حال ابھی کل کی بات ہے

خودداریوں کی چھاؤں میں ہوتی تھی زندگی
لب پر نہ تھا سوال ابھی کل کی بات ہے

جھک کر سبھی سے ملتا تھا چھوٹا ہو یا بڑا
ہر صاحبِ کمال ابھی کل کی بات ہے

عیدوں پہ دو دو چاند نکلتے نہ تھے کبھی
بس ایک تھا ہلال ابھی کل کی بات ہے

بھائی کی کاٹ میں ہے لگا بھائی ان دنوں
ایسا نہ تھا وبال ابھی کل کی بات ہے

ڈاکو کرپٹ چور نہ ہوتے تھے اس قدر
ایسے تھے خال خال ابھی کل کی بات ہے

دو ہی گلاب شاخ پہ عاصی نہ تھے کبھی
کب تھا گلوں کا کال ابھی کل کی بات ہے

دس بیس قتل روز کا معمول بن گئے
ایسا نہ تھا قتال ابھی کل کی بات ہے

کیا دور تھا کہ ہر کوئی رکھتا تھا رو بہ رو
پیشِ نظر مآل ابھی کل کی بات ہے

مرزا عاصی اختر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پالتوں کی عُمروں سے اب ہمیں نکلنے دے
خاک میں لتھڑنے دے پاؤں پاؤں چلنے دے

غزل

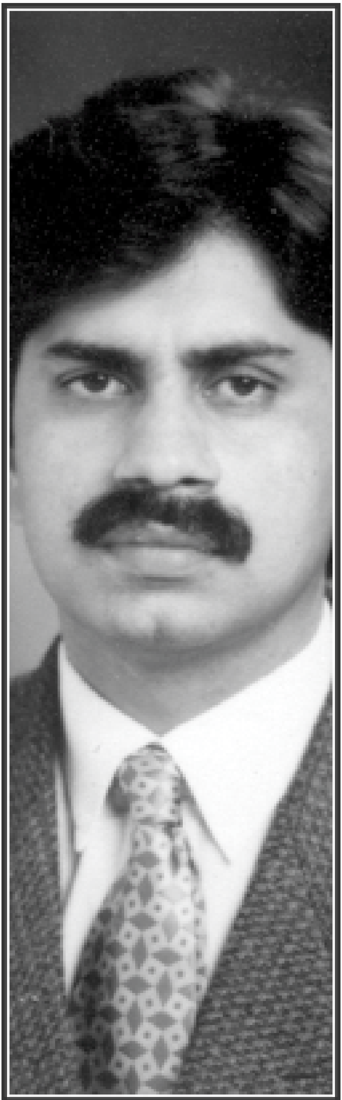

پھر نہ آنے کا یقیں ہم کو دلاتے جاتے
اپنی آنکھوں کی نمی آپ چھپاتے جاتے

اس سے بڑھ کر تو نہیں تھی دلِ ویراں کی طلب
اک نظر دیکھتے اور پھول کھلاتے جاتے

سائے کے ساتھ ہی برکت بھی گئی آنگن سے
پیڑ ہوتا تو پرندے یہاں آتے جاتے

اسکا مطلب ہے ہمیں جینے کی خواہش تھی بہت
ورنہ یوں ظلم پہ ہم سر نہ جھکاتے جاتے

تم ہو مسند کے سزاوار قصیدے کے طفیل
ہجو لکھتے تو رسن بستہ سناتے جاتے

دشت والوں کے لئے ہم جو ہیں آہستہ خرام
تُو بلاتا تو بہت خاک اڑاتے جاتے

اسکو جانا تھا کہ اسکی کوئی منزل ہی نہ تھی
دربدر کر گیا مجھ کو بھی وہ جاتے جاتے

بزمِ احباب میں کیوں بے دلی ایسی جاذب
آ گئے تھے تو میاں شعر سناتے جاتے

شکیل جاذب

غزل

شور برپا ہے سنائی نہیں دیتا کچھ بھی
کیا میں دیکھوں کہ دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ڈوب جائے کوئی ناؤ یا کوئی پار لگے
ناخداؤں کو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

اس قدر درد سے مانوس ہوا دل میرا
کرب میں بھی یہ دہائی نہیں دیتا کچھ بھی

خاک چھانی ہے تیری یاد کے صحراؤں کی
کیوں مجھے آبلہ پائی نہیں دیتا کچھ بھی

دل کے زخموں کا نہیں رونا، مقدر کا ہے
کیوں تیرا دست مسیحائی نہیں دیتا کچھ بھی

منزلِ عشق ابھی دور بہت ہے اشفاقؔ
رہ نما ، راہنمائی نہیں دیتا کچھ بھی

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بستیوں سے جنگلوں کی سمت جاتے تھے مگر
شہر کی پہنائیوں میں گھر کے کھو جاتے نہ تھے

غزل

بے ساختہ نغمہ کا اثر دیر تک رہا
آتش نہ رہ سکی پہ شرر دیر تک رہا

شہرِ وفا کو چھوڑنا آسان تو نہ تھا
دریائے خوں یہ دیدۂ تر دیر تک رہا

دل ٹوٹنا تو ایک ہی ساعت کی بات تھی
دل ٹوٹنے کا درد مگر دیر تک رہا

تجدید ہو یا ترکِ تعلق رہے مدام
یہ مخمصہ بھی زیرِ نظر دیر تک رہا

اس کو بچھڑتے خواب میں دیکھا تھا ایک شب
پھر یوں ہوا کہ خواب کا ڈر دیر تک رہا

یوں بار بار ملنا چلو حادثہ سہی
یہ حادثہ عزیز مگر ، دیر تک رہا

دشمن ہوا تو ساری حدیں پار کر گیا
وہ شخص جو شریکِ سفر دیر تک رہا

اس نے تو جوئے عشق میں پھینکا تھا ایک سنگ
پھر دل میں دائروں کا سفر دیر تک رہا

اب اس میں شورِ گریہ سے رونق ہے ہر گھڑی
اک دشت کا نشان جو گھر دیر تک رہا

شگفتہ نعیم ہاشمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جسم کے پار کون دیکھے گا!
روح کا بار کون دیکھے گا!

غزل

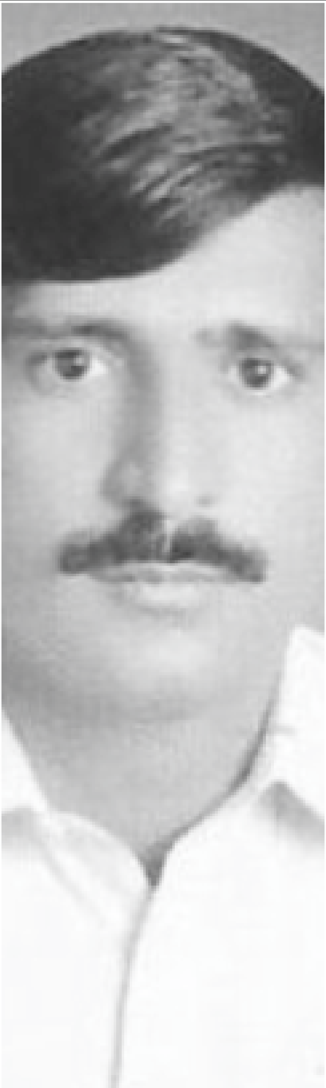

لوگوں کے اس ہجوم نے تنہا کیا مجھے
خود میری پارسائی نے رسوا کیا مجھے

تیری عنایتوں کا بیاں کس طرح کروں
تیری سخا نے دشت سے دریا کیا مجھے

تیری طرح سے میں بھی قدامت پسند تھا
علم و ہنر نے پست سے بالا کیا مجھے

جھٹلا رہے تھے میری ہر اک بات میرے یار
یہ اور بات وقت نے سچا کیا مجھے

مجھ کو پھر اس نے اپنی نظر سے گرا دیا
پہلے تو اپنی آنکھ کا تارا کیا مجھے

اچھا ہوا جو وقت نے پردہ اٹھا دیا
دنیا کی خواہشات نے رسوا کیا مجھے

اس نے مری وفا کا یہ آخر صلہ دیا
دانشؔ بھرے جہاں میں تماشا کیا مجھے

اعجاز دانش

غزل

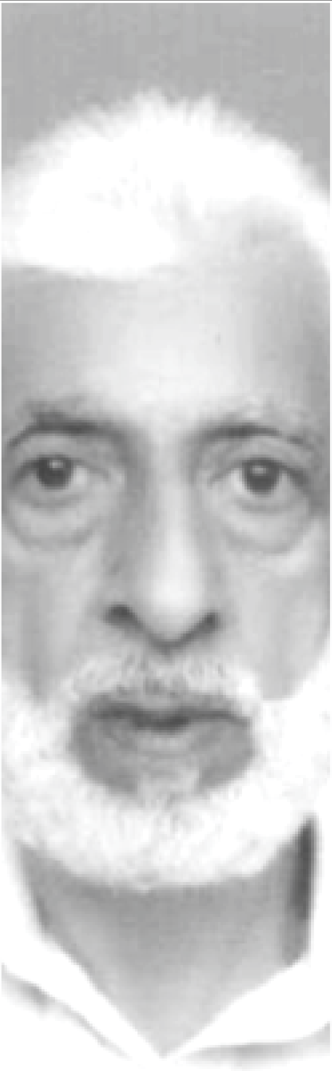

بے وفا نے شرط رکھ دی دوستی کے واسطے
لب نہ کھولوں میں کہیں پر آگہی کے واسطے

فرض ہے سب پر نبھائیں اپنے اپنے عہد کو
سب کو حصہ ڈالنا ہے روشنی کے واسطے

اپنی رسوائی کا ہم کو خوف کب ہے صاحبو
سی رکھے ہیں ہونٹ ہم نے آپ ہی کے واسطے

خون بہتا دیکھنے کا شوق تو مجھ کو نہیں
زخم دل پر کھا رہا ہوں شاعری کے واسطے

حرص و لالچ بے حسی ایماں ہے جن کا دوستو
لوگ ہم کو وہ ملے ہیں رہبری کے واسطے

دو کو رخصت کر دیا ہے باپ نے دے کر جہیز
رات دن ہلکان ہے اب تیسری کے واسطے

خود مسل ڈالا ہے میں نے آرزو کا ہر کنول
اور شاہد کیا میں کرتا زندگی کے واسطے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

ہاں مری آنکھ کا ستارا تھا
وہ جِسے دشت میں پکارا تھا

تیرے عارض پہ دل کشی ہے جو
آرزو نے اُسے سنوارا تھا

سوچتے رہ گئے محبت میں
قرض دل کا کہاں اُتارا تھا

دل کی بستی بسائی تھی جس نے
تیری نظروں کا اِک اشارہ تھا

کھو گیا ساحلوں کے پاس کہیں
جو مسافت میں اک سہارا تھا

طنز کرتا نہیں کبھی اُس پر
وہ محبت میں آپ ہارا تھا

ناؤ لائی بھنور کے بیچ مگر
دُور مجھ سے کہاں کنارا تھا

طاہر حفیظ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ سے جھگڑ کر آن چھپا
تجھ سا جھگڑالو مجھ میں

غزل

یہ صبح ہوتے ہی کیوں آج دن ڈھلا ہوا ہے
ہر ایک چہرے پہ اک سانحہ لکھا ہوا ہے

یہ لگ رہا ہے، کہ مدت سے نہیں وہ گزرا
چراغ راہ بڑی دیر سے بجھا ہوا ہے

مسافتوں کی تھکن جو ابھی نہیں اتری
سفر اک اور میری جیب میں پڑا ہوا ہے

فضا میں روتے پرندوں کو کون سمجھائے
شجر کسی نے گرایا ہے یا گرا ہوا ہے

کسی کی یاد ہے، نفرت ہے یا شکایت ہے
یہ میرے دل میں کوئی کیل سا گڑا ہوا ہے

عبادتوں کی طرح زندگی میں شامل ہے
نماز یاد میں کب مجھ سے وہ قضا ہوا ہے

کسے بتاؤں میں کس کے لیے اداس ہوں آج
کوئی تو ہے جو مری ذات سے جدا ہوا ہے

کہیں یہ ہجر کا آغاز تو نہیں عرفیؔ
تمہاری قربتوں سے دل مرا بھرا ہوا ہے

یہ لوگ کس لیے صحرا میں آ کے رک گئے ہیں
کوئی تو پوچھے یہ کیوں قافلہ رکا ہوا ہے

سمیع اللہ عرفی

انتخاب

– خالد احمد –

نعمان منظور

ہر ہاتھ پہ دھر دیتے ہیں عمروں کا تحیر
یہ لوگ تو آنکھیں بھی چرانے نہیں دیتے

غزل

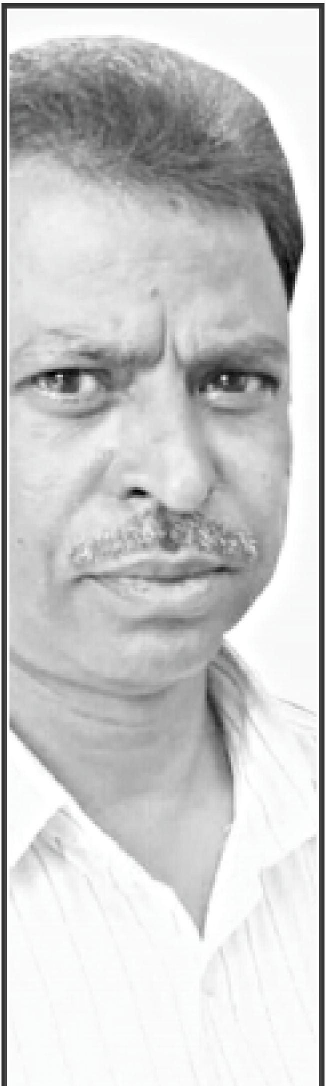

دعا میں مجھ سے رغبت ہو گئی کیا
تجھے اتنی محبت ہو گئی کیا

بنا اس کے ادھورا ہوں بہت میں
وہ اب میری ضرورت ہو گئی کیا

تجھے محسوس کرتا ہوں میں ہر پل
مجھے تجھ سے محبت ہو گئی کیا

تنفس یادوں کی آہوں سے پر ہے
وہ سانسوں میں سرایت ہو گئی کیا

اچانک ہچکی سی آئی ہے مجھ کو
تجھے کاموں سے فرصت ہو گئی کیا

سکوں ملتا نہیں مجھ کو ترے بن
مجھے اب تیری عادت ہو گئی کیا

اسے موجود سے مطلب نہیں ہے
وہ بس تصویر صحبت ہو گئی کیا

ذکی طارق

غزل

شعور دیکھا، مزاج پرکھا، دلیل پائی تو ڈگمگایا
ہزار رمزیں جفا کی لے کر نیا وہ فتویٰ نکال لایا

سکوت میں بھی صدا تھی پنہاں، جو آشنائی سے تھی گریزاں
وہ عکس کیسا، یہ رنگ کس کا، گماں نے خود سے بھی منہ چھپایا

جو رنگ بکھرے، گلال چمکا، تو بات خوشبو سے بڑھ کے پھیلی
ہوا کو چھو کر بجھے چراغوں میں دکھ شکستہ بھی جگمگایا

فصیلِ منطق پہ چادروں نے لہو سے کتنے ہی پھول کاڑھے
کہ سرد لہجے کی ڈھال اوڑھے قدم زمیں پہ وہ رکھ نہ پایا

نظر میں اس کی دھواں معلق، تھا کہنہ منظر پہ عکس میرا
کہ بعد مدّت کے دیکھ مجھ کو، وہ بے وفا کیسا تلملایا

مکالمہ سے گریز پا تھا سو تلخ چھٹی سی چٹان لے کر
وہ لب پہ تھے مہر جیسے پتھر جنھیں جوابوں میں ڈھال لایا

فریبِ معنی نے بھید کتنے ہی وسوسوں کی بنا میں رکھے
یقین اپنی سلامتی کی چمک سنہری بچا نہ پایا

سعدیہ بشیر

غزل

کوئی نہیں مورکھ جو تیرے ناز اٹھائے چلتے وقت
خالی گھر میں کون تجھے اب گلے لگائے چلتے وقت

باغ ہو یا ویرانہ کوئی، ہم نے گریباں چاک رکھا
کیا جانے پھر موسم بدلے، رُت گدرائے چلتے وقت

ہم نے بھی سیل فون کی لوح پہ اک برقی فرمان لکھا
اُس نے بھی تعویذوں پر کچھ نقش بنائے چلتے وقت

اگلے یُگ میں تخت پدھارے بانکے راجہ اندر کون
بھولے بسرے لوگ عجب تھے یاد جو آئے چلتے وقت

اب تو ڈولی شاید اگلے سیارے پر اترے گی
بھیرو ٹھاٹھ میں راگ مری شہنائی گائے چلتے وقت

کوچ کا نعرہ مارا ہم نے، عاشق کا بہروپ بھرا
جانے اب یہ ٹونکی کیا دل بہلائے چلتے وقت

عاشق نے بھر بھر سسکی ٹیٹو گدوایا بازو پر
سکھیوں نے ڈھولک پر بیٹھے گیت سنائے چلتے وقت

رات گئے تک کیفے میں اک شاعر بیٹھا شعر گھڑے
سوچ رہا ہے کون پیے گا ٹھنڈی چائے، چلتے وقت

دستِ اجل سے لڑتے لڑتے پیادے سارے ڈھیر ہوئے
دیکھو اب سالار دلاور، کیا فرمائے چلتے وقت

ہنستے گاتے عمر گزاری، کوچ کی ساعت گریہ کیا
چھوڑو پیارے اب یہ کیسی، ہائے ہائے چلتے وقت

سر پر اک دُم دار ستارا دشتِ بلا میں ظاہر تھا
لمبے ہوتے جاتے تھے جب شام کے سائے چلتے وقت

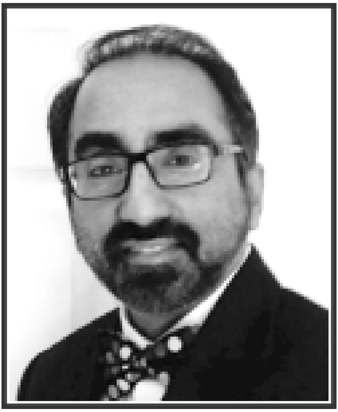

عابد رضا

غزل

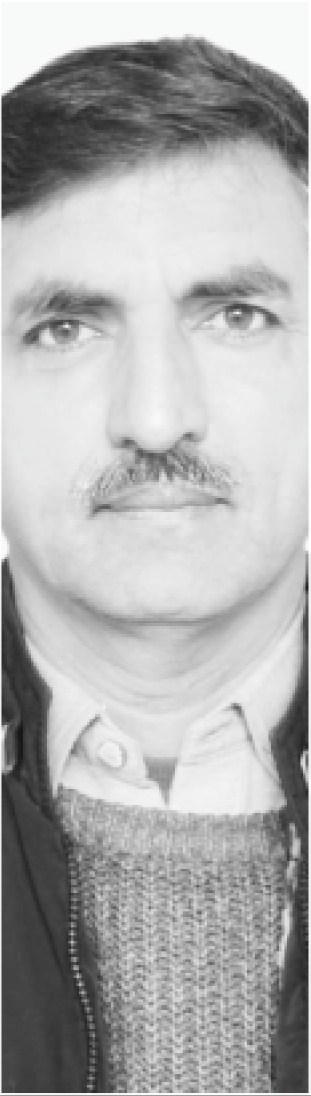

مری یہ گفتگو تجرید میں ہے
تمھارے ہجر کی تمہید میں ہے

نئی تکنیک ہے پیشِ نظر اب
زمانہ بھی نیا تجدید میں ہے

تصور میں مرے وہ خواب لعلیں
سکوں ایسا کہ مروارید میں ہے

کہاں لے جاؤں دل ، یہ خالی آنکھیں
مزا سارا تو لطفِ دید میں ہے

مجھے کہتا ہے صدیوں کا قرینہ
خرابی غیر کی تقلید میں ہے

خدا کے نام پہ کارِ محبت
یہ اِک ذرہ بھی تو خورشید میں ہے

ہمارے پاس آخر کیا ہے امجدؔ
دلوں کا جشن رنگِ عید میں ہے

امجد بابر

غزل

صرف سُنتا سُنانا ہوتا ہے
کس نے وعدہ نبھانا ہوتا ہے

ہر کسی پر یہ بھید کُھلتا نہیں
سانس بھی اک خزانہ ہوتا ہے

عشق کا رزق ہے عجب جس کو
سب نے مل کر کمانا ہوتا ہے

جب طلب ہو کہ سب میسر ہو
خواہشوں کو دبانا ہوتا ہے

سوچ کر اور سمجھ کے عشق کرے
کون اتنا سیانا ہوتا ہے

یوں ترا اسم میرے سینے میں
جیسے قومی ترانہ ہوتا ہے

روشنی سے بنا تعطل کے
میرا ملنا ملانا ہوتا ہے

نشۂ عشق اپنا اپنا ہے
کیا نیا کیا پرانا ہوتا ہے

ایک درویش ہر صدی میں رضا
جس کا عاشق زمانہ ہوتا ہے

مستحسن جامی

غزل

ایک دنیا ہے جہاں کے اُس طرف
اور کتنے ، لامکاں کے اُس طرف

ہے اجل سیلِ رواں کے اِس طرف
زندگی ، سیلِ رواں کے اُس طرف

وہ یہیں ہے اور یہیں پر ہے کہیں
ڈھونڈیے مت آسماں کے اُس طرف

رات کی ٹہنی سے دو تارے چنے
کون رویا، کہکشاں کے اُس طرف

موت کوئی بند دروازہ نہیں
در کھلا ہے اِس مکاں کے اُس طرف

میں کماں کے اِس طرف رونے لگا
رویا تو بھی تھا کماں کے اُس طرف

ہر علامت بے نشاں ہے ، بے نشاں
ہر علامت ہے نشاں کے اُس طرف

اس طرف پژمردگی ، افسردگی
شُستگی ، آبِ رواں کے اُس طرف

سیّد تحسین گیلانی

غزلیں

وہ جس کا کہنا ہے کچھ معجزہ نہیں ہوتا
جدائیوں میں بھی مجھ سے جدا نہیں ہوتا

اخیر گرتا ہے مرجھا کے انتظار کا پھول
پلٹ کے آئیں تو عہدِ وفا نہیں ہوتا

بیانِ حرفِ صداقت میں بھی خسارا سہی
مگر ضمیر میں خنجر گڑا نہیں ہوتا

مثالِ حسن ہے جاذبؔ زوالِ عشق پہ بھی
پرانا ہو کے تو یہ بھی نیا نہیں ہوتا

کبھی کبھی تو کماں خود پہ تان لیتا ہوں
عدو ہی میرے مقابل سدا نہیں ہوتا

اکرم جاذب

کسی مشکل میں گرفتار نہ رہنے دوں گا
خستگی کے کوئی آثار نہ رہنے دوں گا

اس طرح خود کو گنہگار کروں گا ثابت
آپ کے دل پہ کوئی بار نہ رہنے دوں گا

آپ کے واسطے خود کو بھی گرا سکتا ہوں
راہ میں کوئی بھی دیوار نہ رہنے دوں گا

رائج الوقت کوئی سکہ چلے گا کیسے
ثروت و زر ترا معیار نہ رہنے دوں گا

عیب الفت میں مری ڈھونڈتا تھک جائے گا
تجھے تیرا بھی طرفدار نہ رہنے دوں گا

فیصلہ کرنے کا حق مجھ کو ودیعت کر دو
گومگو میں تمھیں سرکار نہ رہنے دوں گا

بس یہی سوچ کے چھوڑ آیا ہوں لشکر جاذبؔ
میں کسی ہاتھ میں تلوار نہ رہنے دوں گا

غزل

نئی زمین ، نیا آسماں بنایا ہے
کسی کے دل میں اگر آشیاں بنایا ہے

کسی سبب سے تمھارا یقیں کیا ہے دوست
کسی سبب سے تمھیں راز داں بنایا ہے

مرے چراغِ سخن سے بچی جو خاک تو پھر
کسی نے اس سے دلِ عاشقاں بنایا ہے

یہ کیسی صلح ہے کیسی لڑائی ہے خود سے
میں دھوپ میں ہوں مگر سائباں بنایا ہے

اسی نے تخت پہ اک دن بٹھانا ہے مجھ کو
اسی نے یوسفِ بے کارواں بنایا ہے

میں سانس سانس لگا ہوں اسے بنانے میں
تجھے خبر نہیں کیسے مکاں بنایا ہے

بنانے والے نے کیا کچھ نہیں بنایا قمر
مرے لیے غمِ سود و زیاں بنایا ہے

قمر نیاز

غزل

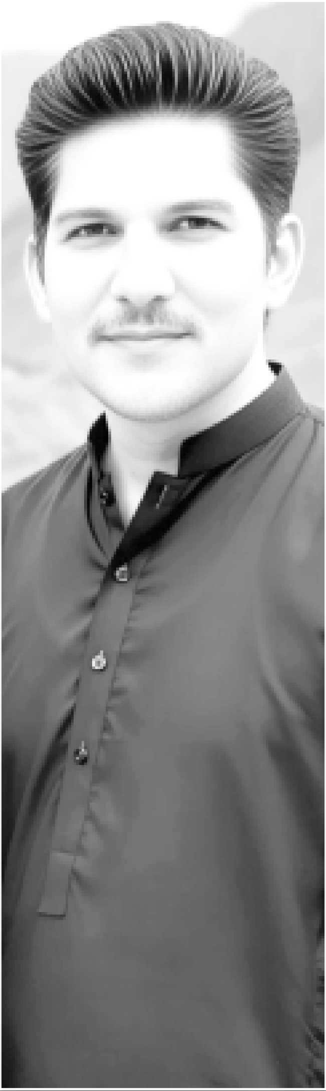

آخری رات ہے مل جُل کے بتانی یعنی
ختم ہونے کو ہے اب اپنی کہانی یعنی

کب تلک ہجر کو سینے سے لگا کر رکھتا
زخم جو تُو نے دیا مجھ کو نشانی یعنی

پیٹ بھرتا ہی نہیں دن کی مشقت کے عوض
تُو سمجھتا ہی نہیں اس کو گرانی یعنی

سو دلیلیں تھیں کہ اب اس سے مقاطع کر لوں
بات دل نے بھی مگر ایک نہ مانی یعنی

اک اثاثہ ہے مرا ساتھ گزارے ہوئے پل
ہاں وہ اک رات، کہ وہ رات سہانی یعنی

میری نظموں، مری غزلوں میں مجھے دیکھ کبھی
میں نے اشعار میں ڈھالی ہے جوانی یعنی

میں نے کردار بدلتے ہوئے دیکھے ارشد
اب وہ راجا ہے کہیں اور نہ رانی یعنی

ارشد محمود ارشد

غزل

کوئی ملتا تو کوئی مل کے بچھڑتا دیکھوں
میں بھی کیا کیا تری دنیا میں تماشا دیکھوں

تُو نے سونپا ہے عجب عالمِ رنگین مجھے
جس میں تا حدِ نظر گونجتا صحرا دیکھوں

کیسے ممکن ہے رقیبوں میں رسائی کا حُصُول
چاند دیکھوں میں کبھی چاند کا ہالہ دیکھوں

جب بھی کھینچے مجھے دل بحرِ جنُوں کی جانب
کوئی کشتی نہ سہارا نہ کنارہ دیکھوں

مال و دولت پہ جنھیں ناز تھا طاقت پہ غرور
ان کے مرقد پہ تو سبزہ بھی نہ اُگتا دیکھوں

تیرے لہجے میں تو تھا میرے لیے آبِ بقا
اب ترے ہاتھ میں بھی زہر کا پیالہ دیکھوں

مجھ کو اے شہرِ نگاراں! تُو رہائی دے دے
زندگی بھر نہ کبھی پھر ترا نقشہ دیکھوں

تُو تو ہر روز بدلتا ہے تقاضے اپنے
دلِ بے خود ترا کیا کیا میں تقاضا دیکھوں

سرور فرحان

غزل

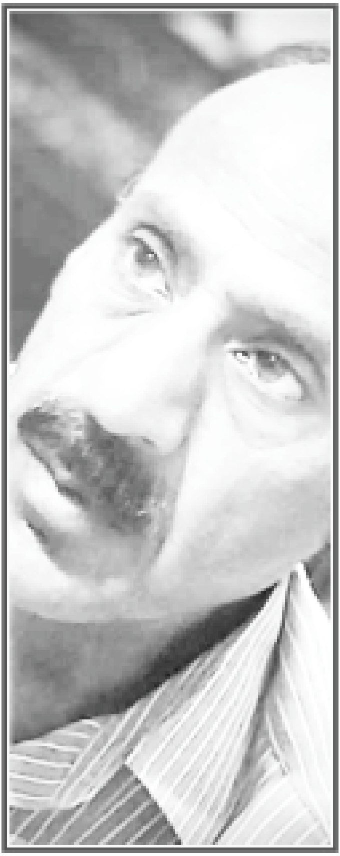

معترف بھی ہیں وہ عنایت کے
پھر بھی انبار ہیں شکایت کے

کوئی سنتا نہیں مرے اقوال
ہیں رتن قیمتی ہدایت کے

چھوڑ دیں شاہ خرچیوں کے چلن
سیکھ لیں کچھ ہنر کفایت کے

تم کو سمجھے تھے پیکرِ اخلاص
تم بھی بندے ہو غرض و غایت کے

ہم دلیلِ سحر کے متلاشی
منتظر روشنی کی آیت کے

معرفت کا نہیں پتا جن کو
مدعی بھی ہیں وہ ولایت کے

کاش بن جاؤ تم امیں قیصرؔ
باپ دادا کی ہر روایت کے

نبیل قیصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بس اک کھٹکا ، بس اک دھڑکا
یاد نہ رکھ لیں ، بھول نہ جائیں

غزل

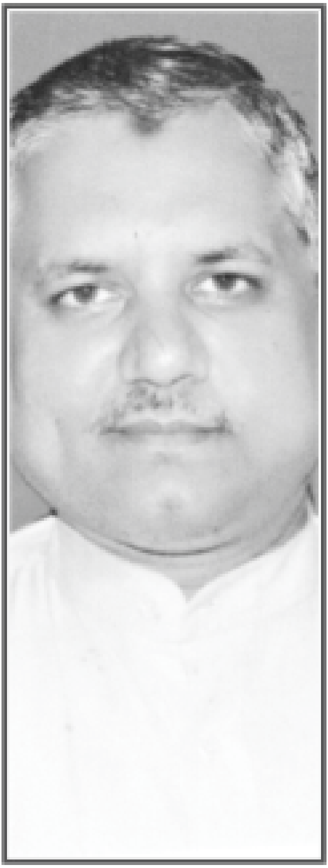

کتنی آسان بنا دی اُس نے
زندگی ہم کو سِکھا دی اُس نے

ہم گریزاں رہے جس سے ہر پل
آج وہ بات سُنا دی اُس نے

ایک تصویر کشی کی ہم نے
ایک تصویر دِکھا دی اُس نے

اب اندھیرے ہی ملیں گے ہر پل
آس کی شمع بجھا دی اُس نے

کچھ بچا ہی نہیں شافؔی کے پاس
اب تو ہستی بھی جلا دی اُس نے

عقیل شافی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کیسی ٹھنڈی ہوا چلی خالد
چاند کیا ، جَل بجھے ستارے بھی

غزل

نوید عاجز

عہدِ نوازشات پہ قائم نہیں رہے
یعنی وہ اپنی بات پہ قائم نہیں رہے

بے مہریٔ جہان کا اُن کو بھی ہے گلہ
جو رسمِ التفات پہ قائم نہیں رہے

قائم رہیں گے بات پہ اپنی وہ کس طرح
جو لوگ اپنی ذات پہ قائم نہیں رہے

لوگوں میں اب وفا ہے نہ پہلا سا وہ سلوک
لوگ ان تکلفات پہ قائم نہیں رہے

مجھ پر ہی بے وفائی کا الزام پھر ہے کیوں؟
وہ بھی تو اپنی بات پہ قائم نہیں رہے

پھر مسکرا کے دیکھ لیا اُس نے اور ہم
ترکِ تعلقات پہ قائم نہیں رہے

غزل

دل ہے بوجھل بے کلی ہے   خود سے بھی ہوں میں گریزاں
کچھ تو ہے جسکی کمی ہے   اک عجب سی تشنگی ہے

بات تو وہ کر رہا تھا   دل کی تنہائی ، عبادت
لہجہ کتنا اجنبی ہے   اب یہی وابستگی ہے

تم نے چھوڑا ہو یا میں نے   خواب رستہ دیکھتے ہیں
بات تو یہ ایک ہی ہے   نیند شب بھر جاگتی ہے

میرے دکھ کو رونے والا   بات کہتے ڈر رہی ہوں
اک شناسا اجنبی ہے   جانے کیسی دوستی ہے

بوجھ ہے اب یہ تعلق
زندگی تھک سی گئی ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پیڑ کب ؟ دامنِ صحرا پہ ہرے دھبّے ہیں
تُو کہاں؟ حرف کی مٹھی میں ترے ریزے ہیں

غزل

سراپا خفا دل، سراپا فغاں ہے
یہ کیسا ہے عالم، یہ کیسا جہاں ہے

کہاں کوئی درماں ہے، مرہم کہاں ہے
کہ ہر ایک چہرہ غموں میں نہاں ہے

یہاں عشق کرنا بھی آسان ہے کب
محبت بھی جیسے کوئی امتحاں ہے

مرا غم حقیقت ہے تو اس لیے ہے
ازل سے یہ دنیا تری ہم زباں ہے

محبت کا موسم خزاں دیدہ نکلا
اداسی کا مسکن مرا گلستاں ہے

وہی رنجِ دنیا ہے اور میری ہستی
نیا کچھ نہیں ہے وہی داستاں ہے

ادھر غم کے سائے بھی گہرے ہوئے ہیں
ادھر صبحِ دل کی ادھوری اذاں ہے

سنبھالے سے بھی دل نہیں ہے سنبھلتا
تری بے رخی آفتِ ناگہاں ہے

یہ ہنگامِ ہجر و زیاں ہے مصیبت
مگر زین پھر بھی بڑا خوش گماں ہے

عبدالرؤف زین

غزل

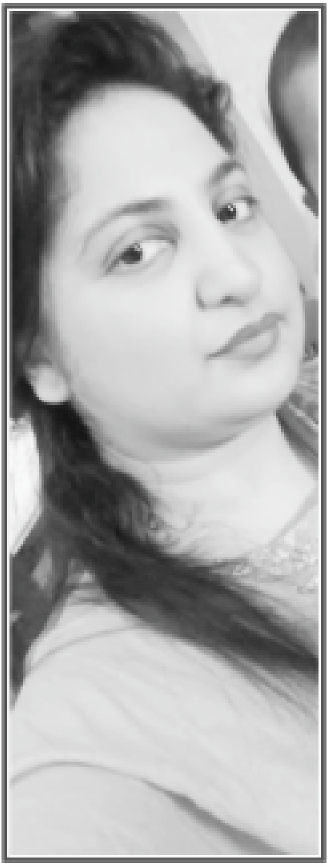

وہ ہاتھ چومتا پہلے جبین اس کے بعد
چمکتا تارے سا چہرہ نگین اس کے بعد

بناتا آب و ہوا اور فضا محبت کی
پھر اس مکان میں ہوتا مکین اس کے بعد

وہ چاند روکتا اور پوچھتا مرے بارے
مدار گھومتا چاہے زمین اس کے بعد

اک اس کے ہونے سے دھڑکن میری ترنگ میں تھی
بنا ہے دل میرا جیسے مشین اس کے بعد

وہ روند دیتا ہے خوابوں کا سبزہ زار اول
جو گھاؤ دیتا ہے گہرا زمین اس کے بعد

گرفت سخت اور مضبوط تھی بہت اس کی
دباؤ لمس کا بالکل مہین اس کے بعد

کشمالہ گیلانی

---- انتخاب ----

— خالد احمد —

بت کو دیکھا تو بت ہوا خالد
جی میں تھا ، دیکھ کر گزر جاؤں

---- نعمان منظور ----

غزل

جس جا دیے جلے تھے وہیں روشنی نہ تھی
اک شہرِ بے ہنر میں کہیں روشنی نہ تھی

حیرت ہے بے شمار عبادت کے باوجود
اک داغ تھا جبیں کے قریں روشنی نہ تھی

آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں روشن ضمیر کو
کیسے کہوں مکاں میں مکیں روشنی نہ تھی

اسباب صبحِ نو کے تو کچھ اور تھے میاں
میرے لیے سحر کا یقیں روشنی نہ تھی

مدفون تھے ہزارہا روشن دماغ پر
بدقسمتی سے زیرِ زمیں روشنی نہ تھی

سب کچھ تھا اس کے زیرِ نگیں اس جہان میں
لیکن کسی کے زیرِ نگیں روشنی نہ تھی

پھر اسکے بعد تیزی سے پھیلی جہان میں
کہتا ہے کون فتحِ مبیں روشنی نہ تھی

روشن ہوئی ہے آپؐ کی بعثت کے بعد یہ
روشن وگرنہ میرے تئیں روشنی نہ تھی

دراصل روشنی کا ہوا ہے ظہور تب
جب خیمۂ وفا میں کہیں روشنی نہ تھی

بستی یہی تھی جس میں دیا ساز لوگ تھے
حیرت کی بات یہ تھی یہیں روشنی نہ تھی

سب پوچھتے ہیں مجھ سے کہ کیا ہو گیا عطاؔ
ظلمت تھی دیدہ زیب حسیں روشنی نہ تھی

عطا العزیز

غزلیں

مجھ کو میری زباں بنا ڈالا
یوں مجھے رائگاں بنا ڈالا

ایک معجز نما نے چٹکی میں
واقفِ لامکاں بنا ڈالا

نیند کی بے نشاں ہتھیلی پر
رتجگے کا نشاں بنا ڈالا

آخرش پھر یقیں پرستوں نے
مجھ کو پورا گماں بنا ڈالا

خواہشوں کے جری قبیلے نے
وشت کو خاکداں بنا ڈالا

رقص کرنے کو آئے گی خوشبو
ہم نے ایسا سماں بنا ڈالا

اسد رضا سحر

جس نے آنگن میں یہ دیوار اٹھائی، بھائی
اُس نے اسلاف کی تہذیب گنوائی، بھائی

جھوٹ بولے گا تو شجرے کا بھرم ٹوٹے گا
اس لیے آج تجھے آنکھ دکھائی، بھائی

ایک گھر میں ہی سما جاتے ہیں سارے ہم لوگ
ہم نے ترتیب ہی کچھ ایسے بنائی، بھائی

اُس کی آواز پہ لبیک کہا بھاگ پڑا
اُس کی آواز ہی جب کان میں آئی، بھائی

ہاتھ ڈالے ہیں ابھی کس نے ندی میں آ کر
آگ پانی میں ابھی کس نے لگائی، بھائی

غزل

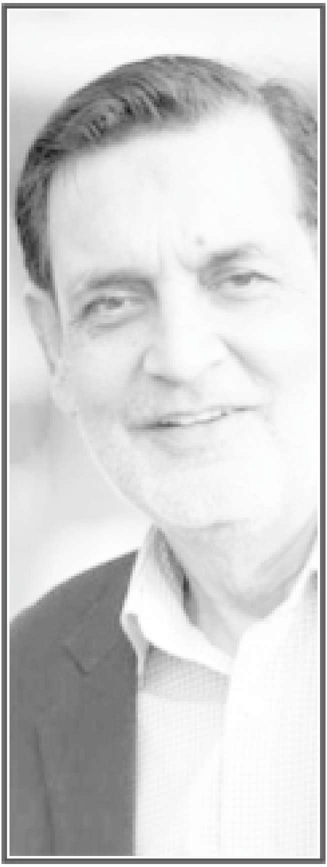

مصروفیت سے اپنی ذرا سا بچا کے وقت
کل پاس آ کے بیٹھنا تم بھی دعا کے وقت

جو ہو چکا جو ہونا ہے سب اس کے بس میں ہے
جو جا چکے جو آئیں گے سب ہیں خدا کے وقت

کھولیں گے پچھلے سینکڑوں یادوں کے سلسلے
جب ہم سے ملنے آنا تو آنا بھلا کے وقت

میں تیری جھیل آنکھوں کی گہرائی میں تھا گم
مشکل میں تو نے ڈال دیا کیوں بتا کے وقت

اس بے سمجھ ضمیر کی وحشت نہ پوچھیے
جو بن خدا کے ہوتا ہے رنج و بلا کے وقت

سیّد مراد کون سی پوری نہیں ہوئی
جب بھی اسے پکارا حدیثِ رسا کے وقت

حسن پرویز سیّد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنا نہ سکا، تیرے بتائے ہوئے رستے
لیکن ترے مانند کسی کا نہ ہوا میں

غزل

احمد ساقی

کبھی جو بھول کر زباں پہ لفظ کاش آ گیا
مری حیاتِ رائگاں میں ارتعاش آ گیا

وہ خوش گمان زود رنج بعد ازاں خجل ہوا
جب اس کے در سے لوٹ کر میں پاش پاش آ گیا

مزید اس کے در پہ بیٹھنا مرا فضول تھا
سو اپنے کاندھے پر اٹھا کے اپنی لاش آ گیا

وہ کون خوش نویس ہے کہ جس کا خط سنوارتے
اک اپنی انگلی کاٹ کر قلم تراش آ گیا

یہ بھید میرے سامنے ابھی تلک کھلا نہیں
قبیلۂ جنوں میں کیسے بدقماش آ گیا

میں اس کے تند و تیز لہجے کا اسیر ہو گیا
دلِ حزیں پہ لے کے اور اک خراش آ گیا

ابھی وہ پہلی جستجو مراد ہو نہ پائی تھی
کہ دل بھی ساتھ لے کے اک نئی تلاش آ گیا

غزل

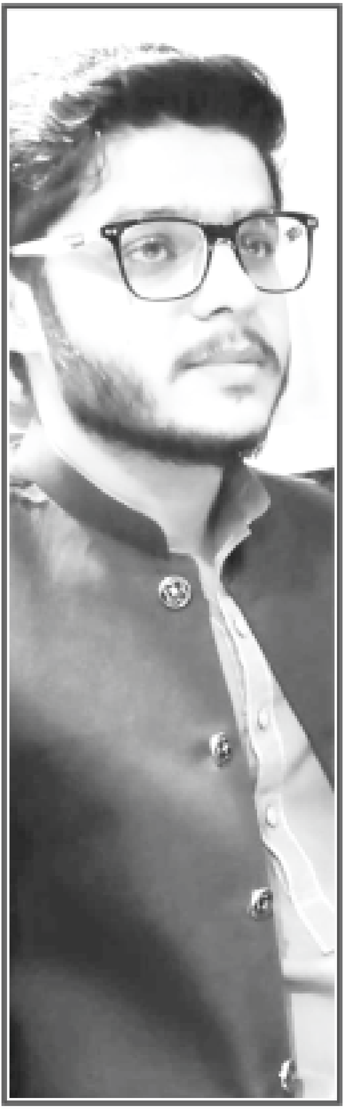

یہ سوچ کے بیٹھا ہے جواں مرد ہمارا
گزرے گا تو دیکھے گا کبھی درد ہمارا

گندم کی طرح ہم کو کڑی دھوپ لگی ہے
اس واسطے یہ رنگ ہوا زرد ہمارا

اُس شخص کا لڑتے ہوئے لہجہ کبھی دیکھو
ہر بات سے ہوتا نہیں سر درد ہمارا

اِک بار تو جیون میں کڑا وقت بھی آئے
معلوم تو ہو، کون ہے ہمدرد ہمارا؟

میں گاؤں میں بیٹھا ہوا کرتا ہوں دعائیں
رہتا ہے ترے شہر میں اِک فرد ہمارا

طلحہ تری ہر بات سدا یاد رہے گی
جب تک نہیں ہوتا یہ لہو سرد ہمارا

طلحہ غفور

غزل

راگ سارے درد والے پھر بجانے لگ گیا
عیب میرے وہ زمانے کو سنانے لگ گیا

سوچتا تھا مر ہی نہ جاؤں تمہارے عشق میں
سوگ زندہ شخص کا وہ پھر منانے لگ گیا

تم نے جب سے داد دی ہے میرے ان اشعار کو
میں تو اس لمحے سے غزلوں کو بنانے لگ گیا

میں نے تو یونہی مزاقاً بے وفا بولا اسے
اور میرا تیر کیسے پھر نشانے لگ گیا

کام سارے سورۂ رحمٰن سن کر جب کیے
پھر وہ بگڑے کام میرے خود بنانے لگ گیا

عزیز قدیر مغل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عجز تک ہم کو تری شان کے شایاں نہ ملا!
اتنے کم مایہ فقط تیرے ثنا خواں کیوں ہیں؟

غزل

دیمک زدہ فریم میں تصویر کی طرح
میں چھن چھنا کے رہ گیا زنجیر کی طرح

جو میرا خواب بن کے لہو میں اتر گیا
اس نے مجھے بھلا دیا تعبیر کی طرح

اک دو سپاہی میرے بھی مارے گئے مگر
میدان میں چلا ہوں میں شمشیر کی طرح

اک حادثے نے مجھکو معطر کیا ہے یوں
اب لوگ مجھ کو چھوتے ہیں اکسیر کی طرح

فاتح سمجھ کے ملتے ہیں دنیا پرست لوگ
میں بھی گلے لگاتا ہوں دلگیر کی طرح

اپنا پرایا چھوڑ کے حق سچ کا ساتھ دو
انجام آ رہا ہے کسی تیر کی طرح

حق سچ کو بھی لکھوں گا مگر سچی بات ہے
جرم و سزا کو لکھوں گا تفسیر کی طرح

اعجازؔ وقت فیصلہ کر دے گا جلد ہی
بیٹھے رہو زمین پہ تاثیر کی طرح

اعجاز رضوی

رباعی

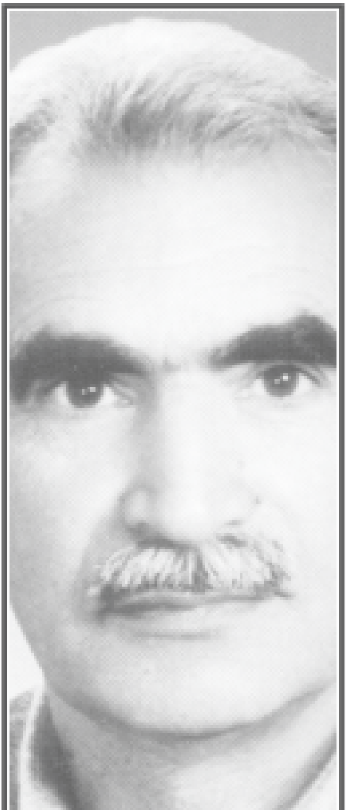

محمد ارشاد

اصناف سخن میں رباعی میری محبوب ترین اور مرغوب ترین صنف رہی ہے۔ لیکن اس کی ساخت اور فہم و تفہیم میں بڑے بڑے رباعی شناسوں کو اکثر ٹھوکر کھاتے دیکھا گیا۔ عمر خیام سے منسوب یہ رباعی جو نول کشور کے مطبوعہ 'رباعیات خیام' (386) میں درج ہے عطار کی ہے:

رفتیم و زما زمانہ آشفتہ بماند
با آنکہ ز صد گہر یکے سفتہ بماند
افسوس کہ صد ہزار معنا ے دقیق
از بے خردیِ خلق ناگفتہ بماند

....

مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے اس رباعی کا ترجمہ یوں کیا: ''ہم گیا کہ دنیا پریشان ہو گئی حالانکہ سینکڑوں معموں اور مسئلوں میں سے ایک ہی لاینحل رہا۔ افسوس کہ بہت سے باریک نکتے لوگوں کی ناسمجھی کی بنا پر میں کہہ نہ سکا۔''
اگر سینکڑوں معموں اور مسئلوں میں سے ایک لاینحل رہا تو بہت باریک نکتے کیونکر رہ گئے ایک سانس میں دو متضاد باتیں پہلے مصرعے کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے جانے دنیا پریشاں ہو گئی بل کہ یہ ہماری زندگی میں لوگ ہم سے آشفتہ یعنی ناخشنود رہے اور ہمارے دنیا سے اُٹھ جان کے بعد بھی ان

کی ناخوشنودی میں کمی نہیں آئی۔ فاضل لکھنوی مزید لکھتے ہیں: ''رباعی کے تیسرے مصرعے میں بندش کی ناپختہ کاری نے بڑی مشکل پیدا کر دی۔ ردیف ہے ''بماند'' اور مصرع چاہتا ہے ''نماند'' بعض شارحین نے ردیف بدل دی اور ''نماند'' ہی پڑھا جیسے افسر الشعراء قزلباش نے ترجمہ یوں کیا:

ہم جل بسے اور زمانہ آشفتہ رہا
سو میں کوئی ایک بھی موتی نہ بندھا
افسوس کہ صد ہزار معنائے دقیق
بے عقلیِ عالم سے میں سمجھا نہ سکا''

....

سچ یہ ہے کہ ''بندش کی ناپختہ کاری نے کوئی مشکل پیدا نہیں کی۔ ''ورسفتن'' کا مطلب نہ سمجھنے میں مشکل پیدا ہوئی ہے وہ بھی ہندوستانی شارحین کے لیے۔ ورسفتن کا مطلب ہے بھید کھولنا۔ عمر خیام کی رباعی ہے:

ایں بحرِ وجود آمدہ بیروں ز نہفت
کس نیست کہ ایں گوہرِ تحقیق بسفت
ہر کس ز سرِ قیاس سودا گفتند
زاں روے کہ ہست کس نمی داند گفت

....

سودا یعنی بڑ بطور خاص مجذوب کی بڑ جس کے اپنے قیاس کے مطابق ہر کوئی معنی و مفہوم اخذ کر سکتا ہے۔ جو بات خیام نے کہی ہے وہی سحابی نجفی نے بھی کہی ہے:

از خلقِ جہاں و ہستیِ فانیِ ما
دانستہ نہ شد بغر نادانیِ ما
حیرانیِ مابود مراد از ہمہ چیز
یا رب چہ مراد است ز حیرانیِ ما

....

حیات و کائنات کی گتھی سلجھانے نسلیں گزر گئیں مختلف ادیان اور ان کے فرقے سلجھانے سے عاجز رہے۔ یہی حال فلسفے کے مختلف مکاتب کا چلا آ رہا ہے۔ نطشے نے سچ کہا کہ عقل ہمیں اس لیے عطا نہیں ہوئی کہ اس سے کائنات کا معما حل کیا جائے۔ چونکہ شاعری بھی جزو یست از پیغمبری اس لیے فانی بدایونی نے کچھ غلط نہیں لکھا:

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

....

جو سمجھے بھی تو کسی کو سمجھا نہ سکے۔ کیا خوب کہا ہے رومی نے:

من گنگِ خواب دیدہ عالم تمام کر
من عاجزم ز گفتن خلق از شنیدنش

(میں وہ گونگا جس نے خواب اور ساری دنیا بہری، میں کہنے سے عاجز نے بھی کہی ہے:

از بس ہمہ جا انجمنِ کراں بود
ما سرمہ شدیم و چشمِ کس باز نہ شد

(ہر کہیں اندھوں کی انجمن تھی ہم سُرمہ ہو گئے لیکن کسی آنکھ کھل نہ پائی)

یونان کے ایک مجذوب فلسفی دیوجانس کلبی جس نے ساری عمر تابوت میں گزاری اور اسی میں دفن بھی ہوا مولانا رومی: نے اس کا بغیر نام لیے ان الفاظ میں ذکر کیا:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام ودد ملولم و انسانم آرزوست

(کل شیخ چراغ لیے شہر میں پھر رہا تھا کہ دام ودد (پالتو اور وحشی) حیوانوں) سے اور انسان ڈھونڈ رہا ہوں)

گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

(میں وہ نہیں پائے جانے کا ہم نے بہت ڈھونڈا۔ کہا وہ جو نہیں پائے جانے کا اسی کی تو طلب رہے)

ایک اور صاحب عرفان کو نے، نام یاد نہیں آ رہا۔ اور رباعی کے بھی آخری دو مصرعے میں یاد رہ گئے ہیں: مجدالدین بغدادی

ہر چند ہزار صاحب ہوس است
لیکن بوجہاں تو کیا دسترس میں است
آں کس کہ بیافت دولتے یافت عظیم
واں را کہ نیافت درد نایافت بس است

(وہ جس نے پالیا بہت بڑی دولت پائی اور وہ نہیں پا سکا اس کے لیے درد نایافت ہی بس کرتا ہے۔)

اسی دیوجانس کلبی کا ذکر نام لیے بغیر نطشے نے اپنی کتاب Thus spoke Zarathustra میں mad man میں کیا جو دن چڑھے چراغ بدست انسان کو بازاروں ہر روز ڈھونڈ رہتا ہے لیکن یہ پاگل Persona ہے خود نطشے کا۔ دیوجانس کھرے سکوں کو کھوٹا ثابت کرتا تھا اور نطشے نے فلسفے کے تمام مکاتب کو کھوٹا ثابت کر دیا۔ اگر کم از کم الفاظ میں بات کروں تو یہ کہنا بہت ہو گا کہ نطشے سے پہلے سارا فلسفہ Essence Precedes Existenc کی تشریح وتعبیر تھا، نطشے نے کہا نہیں Existence Precedes Emssence اور Existencialis کے بانیوں میں ایک ہے۔ اردو والوں نے Existence کا ترجمہ وجود کر رکھا ہے جو محل نظر ہے اس اصطلاح کے معنی وجود تک محدود نہیں کثیر المعانی اصطلاح ہے۔ احمد فراز کے ساتھ دوستی تو نہیں تھی اپنے دوست کے دوست ہونے کی وجہ سے دن میں کئی بار اٹھک بیٹھک رہتی تھی۔ انہی کی ایک غزل کا یہ مصرع ذہن میں آ رہا ہے:

مل گئے وہ بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

دیکھا اور نہ جانے مانگے، درد نایافت کی ٹیس ہے جو محبت میں ناکامی کے یاد آ جانے سے

اُٹھی ہے۔ یہ ناکامی فراز کی شاعری کے بیشتر حصہ میں زیریں رو کے طور پر موجود ہے۔ پختونخواہ کے ایک باکمال شاعر غلام محمد ناصر کا یہ شعر بطور شعر بے مثال ہے۔

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

....

میں نے سنا ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج پشاور میں اُردو کے استاد بھی رہے۔ اگر میرے دور میں ہوتے تو انہیں یہ دعا دیتا اللہ کرے آپ محبت میں کبھی کامیاب نہ ہوں۔ کامیابی ہی درحقیقت ناکامی ہے۔ دردنایافت ہی تو زندگی کا حاصل ہے۔

جوش ملیح آبادی اردو میں سربرآوردہ رباعی گو ہیں لیکن دردنافت کو کچھ سے کچھ کر دیا:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب
ہم ڈھونڈ چکے ملا نہ ہم کو اللہ
اب فرض یہ اس کا ہے کہ ہم کو ڈھونڈے

....

بات بندوں کو اللہ کی اور اللہ کی بندوں کو ڈھونڈنے کی تھی نہیں بزبان اقبال:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

....

جن اصحاب عرفان کی رباعیات قبل ازیں درج ہیں اسی حروف تمنا (آنم آرزوست) کا بیان ہیں۔ جہاں عادب وفلسی کی زبان ناقص ہو وہاں محض شاعری کی زبان کیونکر کافی ہو سکتی ہے۔ اردو کا کوئی ذہانت و فطانت میں غالب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بے شک شاعری جزوے ست از پیغمبر سہی، پیغمبری جزویست از شاعری نہیں۔ ما علّمناہ الشعر (ہم نے پیغمبر کو شعر گوئی نہیں سکھائی، نہ شاعری ان کے شایان شان ہے (قرآن)

عربی شاعری کے بحور و اوزان خلیل بن احمد نے وضع کیے ہیں ان کی بنیاد پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں آیت فلاں بحر میں فلاں وزن پر موزوں ہے۔ سکاکی کی مفتاح العلوم کے آخری صفحات جلال الدین سیوطی نے بعض آیات عربی شاعری کے بحور و اوزان کے مطابق درج کی ہیں لیکن سیوطی کو حاطب اللّیل (رات کے اندھیرے میں ایندھن کے لیے لکڑیاں چننے والا جو سانپ کو لکڑی سمجھ کر اپنے آپ ڈسوا لیتا ہے)

ذکر غالب کا ہو رہا تھا بیچ میں اور باتیں بھی نکل آئیں بیدل کا معنوی شاگرد کر بھی بیدل کے مقام سے پوری آشنائی حاصل ہوئی نہ عرفان تک رسائی۔ بحیثیت شاعر غالب کا بلند مقام

ہے لیکن میں بلا دلیل وثبوت دعویٰ نہیں کرتا، نہ سمجھے سوچے بغیر دوسروں کی رائے اختیار کرتا ہوں چاہے دوسرے ہزاروں کی تعداد میں ہوں۔ جمہوریت سیاست میں کامیابی نہیں علم و ادب کی تو اپنی دنیا ہے۔ فارسی اور عربی رباعی کو متقابل رکھ کر کئی سال میں نے یہ کہا تھا کہ فارسی رباعی پر نہ صرف دستیاب رباعیات کی بنا تفوق رکھتی ہے بل کہ غم زدہ فتادگی کا عنصر بھی وافر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی شاعری کا بہت بڑا سرمایہ ہلاکو خان کے حملے میں جلا دیا اور راکھ تک دجلہ میں بہا دی گئی یہی کچھ اندلس میں بھی ہوا۔ غرناطہ بچ رہا تھا وہاں قرطبہ، طلیطلہ کی طرح فرڈیننڈ اور ازابیلا کی غارت گری کے نتیجے میں سب تباہ و برباد کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ مسجد قرطبہ کے احاطے میں کلیسا تعمیر کر کے مسجد کا حسن تک زخمی کر دیا حالانکہ کلیسا کہیں اور بھی بن سکتا تھا۔

فارسی شاعری کا مزاج غیر متحرک ہے:

ہوگا کسی دیوار کے سایے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

....

فارسی شاعری بستر میں بیٹھ کر یا لیٹ کر کی جانیوالی شاعری ہے بادیہ عرب کے بدوؤں کی زندگی پانی، مویشیوں کے لیے چراگاہوں کی تلاش اور بزبان حالی:

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

....

ان کی زندگی تھی۔ ان کا ایک تابط شرًا بھیڑیے کی طرح ایک آنکھ کھول کر سوتا تھا۔ معمولی سی آہٹ سے بھی جاگ اُٹھتا تھا۔ بدوی زندگی برعکس عجمی فصیلوں میں گھرے شہر اور فصیلوں پر چوکیداروں کی موجودگی بے غم سوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بدوؤں کی متحرک زندگی نے ان کی شاعری کو بھی اسی وصف سے متصف کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے اونٹ بھی حدی خوانوں کی حدی سن کر اپنی چال بدل لیتے تھے۔

اشتر بشعرِ ب در حالت و طرب
گر ذوق نیست ترا کژ طبع جانوری
(سعدی)

کیا فارسی یا کسی بھی دوسری زبان کی شاعری سے ایسی مثال دی جا سکتی ہے

اردو شاعری جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ پھر بھی ہندوستان کی آب و ہوا، بارشوں، وافر چراگاہوں ثمردار باغوں اور فصلوں نے عوام کو کم محنت کش بنا دیا تھا۔ ان کی شاعری کو حرکت سے محروم کر رکھا تھا۔ اگر کسی شاعر کو استثنا حاصل ہے تو وہ اقبال ہیں۔

☆☆☆☆☆

"ازسرِ نو" پر کچھ عبوری باتیں

اشفاق ناصر کی تخلیقی ذات میں شدید تمنائے تکمیل ہونے کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ حالی کے اس شعر کا زندہ مصداق ہے کہ:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

....

وہ اپنے کہے پر مطمئن نہیں ہوتا۔ ہر آن 'ازسرِ نو' کی عبوریت میں رہتا ہے۔ کسی نہ کسی خلا کا احساس اس پر جمود طاری نہیں ہونے دیتا۔ اسی لیے "ازسرِ نو" کی شاعری "آخرِ کار" سے آگے کی جست کا پتا دیتی ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں فکری و فنی دونوں طرح کی پیش رفتوں کا واضح احساس ابھارتی ہیں۔ اس کی شاعری میں سخت صرفِ محنت کے باوجود بے ساختہ پن کی لو سلامت رکھنے کے ہنر سے آشنائی توانا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہر شاعر کی طرح دوسروں سے مختلف ہونے کی للک اسے بھی ہے مگر اس جنون میں اس نے خود کو اچنبھے پیدا کرنے سے محفوظ رکھا ہے۔ یقیناً اس کی روایت شناسی اسے کسی ایسے حادثے سے بچانے میں بہت کام آئی ہے۔ اسے روایت کے تخلیقی تسلسل میں لکھنے والے ایسے شاعروں میں شمار کیا جاسکتا ہے جن کے کلام کے شعری قیام و اعتبار کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اسے قدرت کی طرف سے بڑی حد تک سکون میں تحرک اور تحرک میں سکون اور محدود میں لامحدود دیکھ اور محسوس کر لینے کی حسِ لطیف ارزانی ہوئی ہے، جو انسانی وجدان کو دو اور دو چار کے منطقوں سے آگے کے علاقوں تک رسائی دے سکتی ہے۔ اس استعداد کی خوبی یہ ہے کہ شعری کاوشیں احوال و آثار کی گہری ترجمانی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی کے چمن بھی آباد کرتی چلی جاتی ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہر شخص کا تصورِ خدا جس درجے کا ہوتا ہے وہ اس سے ویسا ہی سلوک کرتا ہے۔ البتہ بعض آوارد لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی تخلیق کار کی تخلیقی دنیا کی مرکزی رو سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ جیسے اقبال کا یہ شعر کہ:

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرم سار ہو مجھ کو بھی شرم سار کر

....

جلیل عالی

ایسے اشعار کو شاعری کی کسی سرمستانہ ترنگ کی جھلک کے طور پر ہی لینا چاہیے ورنہ اپنی خودی پر اصرار کے باوجود ایسا ان سنجلا لب ولہجہ اقبال کی شاعری میں کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ انسان کو کوکری ایشر ٹھہراتے ہوئے بھی خدا کی نیابت کے دائرے میں رکھتا ہے۔ ویسے بھی ہماری تہذیبی روایت کہ

"با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار"

کے مطابق خدا کے ساتھ شوخی کے معنی کچھ اور ہیں۔

اشفاق کا تصورِ خدا بھی قادرِ مطلق والا ہی ہے جیسے:

میں تو خدا سے مانگتا رہتا ہوں یہ دعا
منزل بڑی ہو اور مرا رستہ کٹھن نہ ہو

....

مگر حیرت ہوتی ہے ایک آدھ جگہ شاعر کا رویہ اتنا بے توازن کیسے ہو گیا

اگر تو جاننا چاہے تو تیرہ بختی ہے
اگر تو ماننا چاہے تو بس خدا ہوں میں

(کیونکہ یہ غزل کا شعر ہے حمد کا نہیں اور اس کا پہلا مصرع بھی یہی دلالت کرتا ہے۔)

اسی طرح ایک اور شعر ہے:

میں خود کو اب خدا لگنے لگا ہوں
وہ یوں کھانے لگا ہے میری قسمیں

اگر یہ شعر یوں ہوتا:

وہ خود کو اب خدا لگنے لگا ہے
کوئی کھانے لگا یوں اُس کی قسمیں

....

تو شاید توازن اتنا نہ بگڑتا۔ تاہم اشفاق کی شعری واردات کا عمومی رویہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

اشفاق کے اصیل فکر وفن کے چند نمائندہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پلک پہ ٹھہرا ہوا اشک داستاں گو ہے
تو اس سے پوچھ کبھی کہکشاں سے آگے کا

وہاں پہ صرف محبت کے پھول کھلتے ہیں
عجب علاقہ ہے سود وزیاں سے آگے کا

بجھا الاؤ بتاتا ہے دشت میں کوئی تھا
خبر نہیں مجھے پہلے کی دوسرا میں ہوں

جس نے جانا ہو اسے راہ دکھاتا ہے چراغ
کیا کرے اس کا کہ جس نے کبھی ٹھانی ہی نہ ہو

جانے والوں کو بھلا کیسے کوئی سمجھائے
عکس کچھ آئینہ خانے میں پڑے رہتے ہیں

کچھ بھی موجود نہیں دیدہ وری جاتی ہے
اور کچھ ہے بھی تو وہ بے خبری جاتی ہے

کون سنتا ہے سمجھتا ہے زبانِ درویش
یہ الگ بات کہ اک بھاگ بھری جاتی ہے

کہاں رہیں گے کہیں کے نہ رہنے والے لوگ
تری گلی میں بھی آباد ہو سکے نہ اگر

شکستہ ناؤ کی صورت تھا ایک عشق جسے
نہ پوچھ کس طرح دریا کے پار میں لایا

فلک پہ جانا پڑا تھا مجھے کسی کے لیے
یہ اس کی ضد تھی سو تارے اتار میں لایا

یہ لوگ اس لیے ہم کو دوانہ جانتے تھے
رکے ہوؤں کو میاں ہم روانہ جانتے تھے

مچان چھوڑ کے وہ کب کا جا چکا لوگو
ہم اپنے آپ کو جس کا نشانہ جانتے تھے

دہلیز پر کھڑے ہوئے درویش سے ڈرو
دہلیز پر تمھاری زمانہ ہوا تو پھر

عجب ہے شام کا منظر سمندر کے کنارے پر
کہ جیسے پرتوِ خورشید چشمِ تر میں رکھا ہو

لوگ اٹھ جاتے ہیں جب شمع بجھا دی جائے
میرا رونا تو بہت دیر تلک جاتا ہے

کل شب ترے خیال سے چندھیا گیا تھا میں
میں سوچتا تھا قوتِ دیدار مجھ میں ہے

تھے آنسوؤں سے کوئی بگل بج اٹھا تو بس
لشکر ہے اور جنگ کو تیار مجھ میں ہے

اس نے کہا کہ مانگ لو جو چاہے مانگ لو
اور آج لب پہ کوئی دعا آ نہیں رہی

اس کہانی میں بھلا ذکر مرا کیسے ہو
جس کہانی میں اسے اپنی پڑی رہتی ہے

دھیان جس کو بھی بلاتا ہے چلا آتا ہے
اتنا حیران نہ ہو نامہ بری دیکھ مری

میں اپنے آپ سے باہر سرک گیا اشفاق
کسی کے واسطے دل میں جگہ بناتا ہوا

دشت کے اولیں مسافر تھے
اب تو رستہ بتاتے ہیں ہم لوگ

قطار میں میں اکیلا کھڑا ہوں اور اشفاق
کوئی یہ کہتا ہے ٹھہرو تمھاری باری نہیں

میں مانتا ہی نہیں کوئی نام لے اس کا
اور اس کی آنکھوں میں تصویر رنگ و بو نہ بنے

یہ میں جو حال میں بے حال لگ رہا ہوں تجھے
یہ اتفاق نہیں ہے چناؤ ہے مرے دوست

ہے آج شامِ جدائی بدن کو دشت کرو
اور اتنی خاک اڑاؤ کہ کوئی غم نہ رہے

☆☆☆☆☆

اوریا مقبول جان کا حوالات میں جلتا دیا

مقبولِ عام کالم نگار، اینکر پرسن، سابق بیوروکریٹ اور ڈرامہ نگار اوریا مقبول جان کئی حوالوں سے ملک کے سبھی طبقوں میں متعارف ہیں۔ وہ سول سروس کے دوران میں کئی شہروں میں ڈپٹی کمشنر کے طور پر تعینات رہ چکے ہیں۔ کالم نگاری میں کئی سال تک بہترین کالم نگار کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ملک کے مقبول عام اخبارات میں ان کا کالم ''حرفِ راز'' کے مستقل عنوان سے شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ مجموعی لحاظ سے وہ ایک نڈر اور بیباک صحافی ہیں۔ راقم السطور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ کچھ سال قبل نمل یونیورسٹی میں منعقدہ کتاب میلے میں ایک اشاعتی ادارے کے سٹال پر میری ان سے ملاقات ہوئی تھی جہاں میں نے انھیں اپنا شعری مجموعہ بھی پیش کیا تھا۔

اپنے شعری مجموعے ''اک دیا جل رہا تھا حوالات میں'' کے ذریعے وہ بطور شاعر ادبی حلقوں میں پہلی بار متعارف نہیں ہو رہے کہ اس سے قبل ان کا ایک شعری مجموعہ ''قامت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو بیشتر رومانی رجحانات پر مبنی تھا۔ تاہم دیگر میدانوں میں ان کی شہرت ان کی شعری شخصیت کو کسی قدر دھندلا چکی تھی۔ اب اس دوسرے شعری مجموعے نے نہ صرف ان کی شعری امیج کو واضح طور پر متعارف کر دیا ہے بلکہ ان کی اس امیج کو بھی وسعت عطا کر دی ہے جو اب تک ان کے کالموں میں اور میڈیا میں نمایاں تھی۔ اور جو مزاحمتی رویہ اُن سے منسلک ہو چکا ہے اس کتاب کے اشعار ان

نسیم سحر

کی تصدیق و توسیع کر رہے ہیں۔

یہ کتاب حال ہی میں قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل سے علامہ عبدالستار عاصم کے زیرِ اہتمام نہایت سلیقے اور قرینے سے شائع ہوئی ہے۔اس کا عنوان ہی اس کے مندرجات کی واضح عکاسی کر رہا ہے جبکہ کتاب کا یہ انتساب ''۲۲/ اگست کے نام، جس دن مجھے زندگی بھر کی مشقتوں، محنتوں اور آزمائشوں کا ثمر ملا'' بھی قاری پر ان کی تمام کیفیات و محسوسات آشکار کر رہا ہے جب وہ ناکردہ گناہی کے الزام میں پابندِ سلاسل کیے گئے تھے۔ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں جناب اوریا مقبول جان نے اپنے ایامِ اسیری اور ''ایامِ حوالات'' کی روداد جس ادبی اسلوب میں بیان کی ہے وہ ہمیں مولانا حسرت موہانی، فیض احمد فیض، شورش کاشمیری اور دیگر ایسے اسیران کے شعری طرزِ اظہار کی یاد دلا دیتی ہے کہ اس شاعری میں مزاحمتی رنگ کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی جھلملا اور جگمگا رہی ہے۔اس کتاب کا عنوان ان دنوں کی ترجمانی کر رہا ہے جب انہیں مذہبی منافرت اور اداروں کے خلاف باتوں پر سائبر ٹیررازم کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔

اوریا مقبول جان کا شعری خطے میں دخول کوئی حالیہ واقعہ نہیں جس کا احساس کتاب میں شامل کچھ چوٹی کے سخنوروں کے دیباچوں اور فلیپس سے ہوتا ہے۔ ان میں جہاں ڈاکٹر خورشید رضوی اور تحسین فراقی، انور مقصود، ہارون الرشید جیسی ادب اور میڈیا سے وابستہ نامور ہستیاں شامل ہیں وہیں نوشی گیلانی اور احمد فرہاد جیسے نسبتاً جدید نسل کے شعرائے کرام کی قابلِ قدر تحاریر بھی شامل ہیں۔اس کتاب کا آغاز چند تقدیسی منظومات سے ہوتا ہے جس کے بعد غزلوں اور نظموں کا ایک چمن زار ملکی ماحول کے بہار و خزاں کے منظر نامے دکھا رہا ہے۔اس کے بعد کا مختصر حصہ چار خوبصورت تخلیقات پر مشتمل ہے جس میں اوریا مقبول جان اپنے گھرانے سے محبتیں بکھیر رہے ہیں ۔ان میں زوجہ کی پینتالیسویں سالگرہ پر نظم کے علاوہ دو بیٹیوں کی رخصتی کے موقع پر کہی گئی نظمیں شامل ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ ''ایامِ اسیری کی شاعری'' کے عنوان سے کچھ ایسی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے جو اوریا مقبول جان نے حوالات میں، کیمپ جیل لاہور میں ۲۰۲۴ء کے سال کے آخری ان مہینوں میں لکھیں جب وہ ''عتابِ شاہی''

کا شکار ہو کر قید و بند کی صعوبتیں کاٹ رہے تھے۔ یہی حصہ ان کی پنجابی نظم ''میری دھرتی۔۔ میری جیل'' پر تمام ہوتا ہے جس کا عنوان ہی اوریا مقبول جان کے الفاظ میں پورے ملک کی داستان چند لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔

مجموعی طور پر اوریا مقبول جان کا یہ مزاحمتی رویہ ان کی پوری شاعری سے نمایاں ہو رہا ہے۔ تاہم ایامِ اسیری میں کہی گئی منظومات میں ان کے لہجے میں کچھ باغیانہ پن اور احتجاجی رنگ بھی اتر آیا ہے۔ اس کا آغاز جس نعت سے ہوتا ہے اس میں اس اسیری میں انہیں تخلیق کی جو روشنی عطا ہو رہی ہے اس پر اس شعر میں کیا خوب اظہار ہو رہا ہے:

یہ فیضِ نسبتِ نعلینِ پاک ہے، کہ یہاں
مرے لیے ہوئی روشن قفس کی تنہائی

....

اب اس قفس کی تنہائی میں روشن دیے میں انہوں نے کس کس انداز میں شعر کہے اور اپنی انفرادی کیفیت میں اجتماعی کیفیات کا احاطہ کس انداز میں کیا ہے وہ درج ذیل کچھ منتخب شعراء سے ملاحظہ ہو۔ پہلے ''اک دیا جل رہا تھا حوالات میں'' کے عنوان سے نظم کا ایک بند دیکھیے:

خوف کے شہر میں، ظلم کی رات میں
اک دیا جل رہا تھا حوالات میں

وہ جو صدیوں سے محکوم و مجبور ہیں
وہ جو صدیوں سے لاچار و مقہور ہیں
جن کی آنکھوں کے سب خواب مرجھا گئے
جن کے سورج چراغوں کے گہنا گئے
ان کے بے مایہ اشکوں کی برسات میں
اک دیا جل رہا تھا حوالات میں

....

ان کی نظموں میں بے مایہ قیدیوں کے شب و روز، مصلحت پرست دوستوں کے نام کے عنوانات سے نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس حصے کی غزلوں میں بھی یہی کیفیات یوں بیان ہوئی ہیں:

روزنِ زنداں سے سارا شہر زندانی دِکھے
موسمِ گریہ میں جیسے ہر طرف پانی دِکھے

باغباں جو بھی ملا، اس نے اجاڑا گلستاں
دشت کی صورت مرے شہروں کی ویرانی دِکھے

....

یہ کیسی بے بسی ہے شہرِ بے منزل کے لوگوں میں
سکوتِ مرگ ایسا ہے، صدا آتی نہیں کوئی

....

اس ''زندانی'' شاعری کے علاوہ کتاب کی دوسری شاعری میں بھی اوریا مقبول جان کے یہی رویے دیگر رومانی،

جمالیاتی رنگوں کے ساتھ ساتھ اپنی جھلک دکھا رہے ہیں، حوالات اور زنداں سے باہر کبھی جانے والی ان کی شاعری بھی ''چھوٹی جیل'' سے ''بڑی جیل'' تک کے سفر کی سمت نمائی کر رہی ہے۔ چند اس رنگ کے شعر بھی ملاحظہ ہوں:

اک عذاب حبسِ حرفِ حق ہے سینے پر گراں
دم کہاں آئے کسی دم، دم نکل جانے کے بعد

خوابوں کی سرزمیں کے مسافر کا راستہ
انجامِ کار شہرِ اَلم ناک تک گیا

کل گھر جسے کہتے تھے پڑاؤ ہے کوئی اب
اِک چھت جو اماں دیتی تھی اب خوف نشاں ہے

اتار اِک اسم ہونٹوں پر کہ جو شافی ہو کافی ہو
دُعا ایسی کہ جس سے موسمِ ردِ بلا آئے

ابھی تو روشنی پھوٹی تھی گھر میں
ابھی سے سائے بڑھتے جا رہے ہیں

....

اسی نسبت سے ان کا ایک قطعہ اپنا قلم بیچنے والوں کے نام بھی ہے، جس کے تیور دیکھنے والے ہیں:

تمھاری طرح ہم بھی مصلحت کرتے تو جی لیتے
یزیدِ وقت کی بیعت اگر کرتے تو جی لیتے
تمھیں تو مل گئی شہرت قلم کو بیچ کر اپنے
وصول اپنی بھی ہم قیمت اگر کرتے تو جی لیتے

اوریا مقبول جان کی اس کتاب کو درج بالا جن دانشوروں اور مشاہیر ادب و صحافت نے اپنی آراء سے آراستہ کیا ہے ان تمام کا مجموعی تاثر راقم السطور کے اس اظہاریے کو تقویت بخش رہا ہے۔ لازمی سمجھتا ہوں کہ ان معتبر نقادانِ فن کی بیش قیمت تحاریر کے مختصر اقتباسات سے اپنے اس مضمون کو مزین کیا جائے:

☆ یہ مجموعہ اُن کی طبیعت کے متنوع عناصر کی مجموعی آئینہ داری کرتا ہے۔ ان عناصر میں حریرو پرنیاں اور سیرتِ فولاد دونوں کا عکس ملتا ہے-- توانا عقیدے، مضبوط توکل، مزاحمت اور استقامت سب پہلوؤں کی غماز ایک قوس قزح اس تازہ دیوان میں جھلکتی ہے۔ (ڈاکٹر خورشید رضوی)

☆ --اس مجموعے کی ایک جہت ایام اسیری کی مظہر بھی ہے۔ شاعر کی درد مندی اور ابنائے جنس کی بے بسی کے احساس نے اظہار کی ندرت سے، جوان اوراق میں جا بجا اس نظر آتی ہے، گھل مل کر اس مجموعے کو ہمارے لیے قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔ دھیمے غم اور گہرے اضطراب کی ردا میں لپٹی اس شاعری کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ (ڈاکٹر تحسین فراقی)

☆ فیضؔ، جالبؔ اور فرازؔ کی طرح اوریا مقبول جان صاحب کو بھی اچھے دن گزارنے کے لیے حوالات جانا پڑا۔
خوش نصیب ہیں اوریا صاحب، حوالات میں اک دیا تو جل رہا تھا، حوالات کے باہر پورا ملک جل رہا تھا۔ (انور مقصود)
☆ مختصر سے عرصے میں تکمیل پانے والے اس دیوان کا ایک ایک لفظ دل کو چھوتا ہے، ایک ایک مصرعہ درد اگاتا ہے۔ ایک ایک غزل اور ایک ایک نظم۔ یہی درد انسانیت کی معراج ہے۔ اسی سے مٹی کے پیکر میں نمی ہوتی ہے، اسی سے روئیدگی۔ آخرکار اسی سے ایمان، خیر اور تہور کی فصلیں اگتی ہیں--- امام غزالی نے کہا تھا: وہ آخری چیز جو درویش کے سینے سے رخصت ہوتی ہے، ستائش کی تمنا ہے، درد کی دوست تو نصیب ہے، اوریا مقبول جان کو یہ منزل بھی پروردگار عطا کرے۔ (ہارون الرشید)
☆ جس خطۂ ارض سے ہمارا تعلق ہے وہاں پر نعرۂ حق بلند کرنے والوں کے لیے ہر گام پر صلیبیں نصب کر دی جاتی ہیں۔ اور آوازیں قتل کرنے کے جنون میں انسان قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر ان جبر پرستوں کے ہاتھ شہ رگ نہ پہنچ سکیں تب بھی حق پرستوں کو زندانوں کا ایندھن بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، اوریا صاحب کو بھی اس کٹھن مرحلے سے گزرنا تھا، سو گزرے، اور وہ بھی پوری شان کے ساتھ۔ زنجیر بکف، آزاد منش درویش کی روشن مزاجی دیکھیں کہ انھوں نے اسیری کے سیاہ دور میں بھی ایک دیا جلائے رکھا، سچ کا دیا! (نوشی گیلانی)
☆ اوریا مقبول جان خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے فیض، پابلو نرودا اور ناظم حکمت کی راہ کا انتخاب کیا۔ انہوں نے جو جیا اسے لکھا اور جو لکھا اسے جیا۔ مجھے یقین ہے کہ کل کی تاریخ اوریا مقبول جان کے قلم اور زبان دونوں کی ممنونِ احسان رہے گی۔ (احمد فرہاد)
ان چند اہم مزاحمتی دانشوروں کی آراء درج کرنے کے لیے ان سب کے لیے اظہارِ ممنونیت کے الفاظ کے ساتھ یہ اظہاریہ تمام کیا جا رہا ہے، اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ اظہاریہ ان کی شاعری کے دیگر محاسن اور فنی و اسلوبی خوبیوں کا تفصیلی ذکر نہیں کر سکتا جس کے لیے یقیناً ایک دفتر درکار ہے۔

☆☆☆☆☆

اَدب اَدیب اَور اِسلام عظمی [1961 سے شروع ہونے والا ادبی سفرنامہ] (قسط دوم)

اسلام عظمی

گورنمنٹ دیال سنگھ لائبریری میں حلقہ اربابِ غالب کے پہلے جلسے میں میں نے اپنا ایک گم شدہ افسانہ دوبارہ لکھ کر تنقید کے لیے پیش کیا۔ صاحبِ صدارت سید قاسم محمود تھے۔ انھوں نے افسانے کی خاصی تعریف کی۔ خالد احمد نے افسانہ مجھ سے لے لیا۔ چند روز بعد مجھے دفتر میں شفیق سلیمی کا فون آیا۔ شفیق سلیمی سے بھی تب تک میری چند ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں۔ اس نے پوچھا ”تم نے حلقے میں مطبوعہ افسانہ کیوں پڑھ دیا۔ جو افسانہ تم نے حلقے میں پڑھا وہ فنون میں بہت پہلے شائع ہو چکا تھا۔ حلقے میں دھیان سے آنا کیونکہ خالد احمد بہت غصے میں ہے۔“

”میرے حساب سے تو وہ مطبوعہ نہیں۔ وہ افسانہ مجھ سے مال روڈ پر کہیں گر گیا تھا۔ اور حلقے میں پڑھنے کے لیے میں نے دوبارہ لکھا تھا۔“

اگلے اجلاس پر حلقے میں گیا تو خالد احمد نے پوچھا ”کیا تمھیں یہ پتا نہیں کہ حلقے میں مطبوعہ افسانہ پڑھا جاتا؟“

میں نے بات کی وضاحت کی تو خالد احمد نے کہا۔

"کتابت ہو چکنے کے بعد ضیا بٹ نے کہا کہ یہ افسانہ تو فنون ہی میں چھپا ہوا لگتا ہے۔ چیک کیا تو یہ افسانہ فنون میں تمھارے نام ہی سے چھپا ہوا تھا۔ لوگ فنون میں چھپنے کو ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔ تم کیسے آدمی ہو کہ فنون میں چھپے اوراس بھی خبر نہیں ہوئی۔"

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ گمشدہ افسانہ میرے نام ہی سے شائع ہوا تھا۔ اگر کوئی میرا نام کاٹ کر اپنے نام سے چھپوا چکا ہوتا تو۔۔۔

حلقے کا اجلاس ختم ہوتا شرکا قریب کے ایک ڈھابا نما ہوٹل پر جمع ہو جاتے۔ حلقے میں تواتر سے آنے والوں میں سے جو نام مجھے اَب تک یاد ہیں اُن میں خالد احمد، نجیب احمد، قائم نقوی، شفیق سلیمی، ضیا نیر، زمان کنجاہی، حسن رضوی اور اختر کاظمی ہیں۔ یہ سب لوگ اَب اِس دنیا میں نہیں رہے۔ یہ نام جب یاد آتے ہیں تو خود کو نسبت روڈ کے اُسی ڈھابے پر بیٹھا ہوا اور اُن کے ساتھ باتیں کرتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ حلقے میں آنے والوں میں مستنصر حسین تارڑ، سعادت سعید، انعام الحق جاوید، محمد سلیم طاہر، غلام محمد قاصر، سعادت سعید، ضیا بٹ، نعیم اظہر اور بہت سے اور لوگ تھے۔

ایک بار آزر تمنا، مبارک ڈار اور میں سائیکلوں پر نسبت روڈ سے نکل کر میکلوڈ روڈ کے سگنل پر پہنچے تو مبارک ڈار بے دھیانی میں سرخ سگنل کراس کر گئے۔ مبارک احمد کے نثری شاعری کے حق میں لکھے ہوئے طویل مضامین نوائے وقت کے ادبی صفحات پر شائع ہو چکے تھے۔ سگنل کراس کرنے کے بعد میں نے مبارک احمد کو جا لیا۔

"ڈار صاحب' میں تو سمجھتا تھا کہ آپ شاعری میں قواعد کے خلاف ہیں مگر آپ تو ٹریفک کے قواعد کے بھی خلاف نکلے۔"

اب پھر ڈھابے کی طرف پلٹتے ہیں۔ اُن دنوں حسن رضوی کا یہ شعر بہت اونچا اُڑ رہا تھا۔

میں آگ ہوں اور آگ ہی سے میرا میل ہے
میری رگوں نے خون نہیں مٹی کا تیل ہے

....

اختر کاظمی وقتاً فوقتاً حسن رضوی سے اس غزل کی فرمائش کر دیتا "حسن رضوی سانڈے کے تیل والی اپنی غزل تو سناؤ۔ کمال کی غزل ہے۔"

حسن رضوی کو میں نے اس بات پر خفا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ حلقے میں آنے والے لکھاریوں میں سے صرف اُس کے پاس کار تھی۔ پرانی تھی مگر چلتی کا نام گاڑی ہے۔ کوئی مذاقاً کہتا۔

"کار ہو تو حسن رضوی جیسی۔ مائلیج سو کلومیٹر

فی لٹر سے زیادہ ہے۔"

"اتنی لمبی نہ چھوڑو۔ اتنی مائیلج تو نئی گاڑیوں کی بھی نہیں ہوتی۔"

"درست مگر حسن رضوی کی کار کی مائیلج صرف پیٹرول کی مرہونِ منت نہیں۔ مائیلج وہ دھکے بھی بڑھاتے ہیں جو سٹارٹ نہ ہونے پر دوسروں سے لگوائے جاتے ہیں۔"

اُن دنوں میں ادبی محفلوں میں نووارد تھا اور لکھاریوں سے ناواقف بھی۔ ایک روز خالد احمد سے پوچھا "اختر کاظمی کیا اکبر کاظمی کا بیٹا ہے؟"

"بالکل۔"

میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ اکبر کاظمی کے شعری مجموعے کا دیباچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے۔ اس لحاظ سے اکبر کاظمی میرے لیے بہت معتبر شاعر بنتا تھا۔

"اکبر کاظمی کیا بہت بڑا شاعر ہے۔"

خالد احمد مسکرا دیا "جس شاعر کے شعری مجموعے کا دیباچہ کوئی مولانا لکھے' اُس کی شاعری کا فیصلہ تم خود کر سکتے ہو۔"

خالد احمد سے میری واقفیت نئی نئی تھی۔ بہت بعد میں مجھ پر کھلا کہ خالد احمد کی باتیں اتنی سیدھی بھی نہیں ہوتیں۔ اختر کاظمی دوسروں پر خوب جملے کستا۔

اُن دنوں میٹرک یا پھر ایف اے کی انگریزی کی کتاب میں کچھ اس طرح کی ایک نظم تھی۔

There is villa

There is a room in the villa

There is a Table in the room

نظم میں اسی طرح کے فقرے تھے۔ اختر کاظمی نے انگریزی نظم کی پیروڈی لکھی ہوئی تھی۔

کمرے میں صوفہ
صوفے پہ ل۔۔ ی
ل۔۔ ی پہ ل۔۔ ا
دونوں پہ چادر
چادر میں حرکت
حرکت میں برکت
چلو ہم بھی دیکھیں
یہ کیا ہو رہا ہے

تیس برسوں کی بے وطنی کے بعد واپسی ہوئی تو ایک بار حلقہ اربابِ ذوق کے جلسے میں گیا۔ ایک باریش فرد شناسا سا لگا۔ وہ اختر کاظمی تھا۔ ڈاڑھی کے ساتھ بالکل الگ شخصیت۔ یکبارگی احمد مشتاق کا شعر یاد آ گیا۔

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اُس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

ایک پرانی کہانی کے مطابق عمومی طور پر زندگی کے کئی ادوار ہیں۔ عام مرد بندر، گھوڑے، گدھے اور اُلو کے علامتی اَدوار سے گزرتا ہے۔

نوجوانی میں اوروں کو دیکھ کر بندر کی طرح نقل کرتا اور خود کو بناتا سنوارتا ہے۔

جوانی میں ''میں ہی میں'' کیفیت ہوتی ہے۔ گھوڑے کی طرح کسی کو اپنے پنڈے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔

اَدھیڑ عمری میں ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں تو گدھے کی ہر بوجھ بغیر چوں چرا اُٹھالیتا ہے۔

عمر اور بڑھتی ہے تو پوتے پوتیاں اور دوہتے دوہتیاں کو کھیلتے کودتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُن کی ناپسندیدہ حرکات پر بھی چپ رہتا ہے اور اُلو کی طرح دیدے گھماتا رہتا ہے۔ خاندانی نظام مدتوں ایسا رہا مگر وقت نے بہت کچھ بدل دیا ہے۔

پردیس میں تیس سال گزارنے کے بعد واپس لوٹا تو ٹھیک ایک سال کے بعد ایک انڈین دوست یعقوب منشی کا فون آیا۔ اُس نے بتایا ''عراقی حامد کہ رہا کہ عبدالسلام کو کہو کہ پاسپورٹ بدل کر پھر آئے۔ اس کے کام کی ابھی بھی گنجائش ہے۔''

میں چونسٹھ سے زیادہ برس کا ہو کر واپس لوٹا تھا۔ میں نے جواب دیا ''منشی بھائی، اب نہیں۔ اَب مجھے اپنے پوتے پوتیوں سے کھیلنا اچھا لگتا ہے۔''

میرے جواب پر پچیس سالہ رفاقت والا منشی بھائی ناراض ہو گیا۔ سالانہ چھٹی پر لاہور آتا تو 'فنون' کے دفتر میں جناب احمد ندیم قاسمی سے ملنے ضرور جاتا۔ اعجاز رضوی سے میری پہلی ملاقات 'فنون' کے لوئر مال کے آخر میں فاؤنٹین ہاؤس کو جانے والی گلی کے آس پاس کی کسی گلی میں ہوئی تھی۔ ایک بار پاک ٹی ہاؤس سے فنون کے دفتر جانے کے لیے نکلا تو علی اکبر عباس گاڑی سٹارٹ کر رہے تھے۔ اُنھوں نے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ ''گاڑی میں بٹھانے سے پہلے یہ تو پوچھ لیں کہ جانا کہاں ہے؟'' علی اکبر عباس نے مسکرا کر کہا ''فنون کے دفتر کے علاوہ آپ نے اور کہاں جانا ہے۔''

خالد احمد سے ملنے کے لیے میں گورنمنٹ دیال سنگھ لائبریری کے پیچھے اُس کی رہائش گاہ پر چلا جاتا۔ نجیب احمد سے وہاں ملاقات ہو جاتی یا پھر ہم نجیب احمد کے پاس چلے جاتے۔

ایک بار دن کے کوئی بارہ بجے خالد احمد سے ملنے کے لیے گیا۔ گھر کے کسی فرد نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کو کہا۔ خاصی دیر کے بعد خالد احمد آیا۔ مجھے

دیکھا تو کہا ”مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ تم لاہور میں ہو۔ بے وقت جگانے پر میں سمجھ گیا تھا کہ اسلام عظمی آیا ہوگا۔“

”اسلام عظمی ہی کیوں؟“

” میرے جاننے والے میرے سونے جاگنے کے اوقات سے واقف ہیں۔“

’فنون‘ میں میری ایک ساتھ چار غزلوں کے چھپنے کی بات ہوئی تو خالد احمد نے کہا ”اسلام عظمی‘ تم شاعر ہو چکے ہوں۔ البتہ کو ’میں‘ سے جیسی غلطیاں کر دیتے ہو۔ پھر پوچھا۔ کوئی تازہ غزل کہی۔ میں نے اُسی روز ایک غزل کہی تھی۔ غزل میری ڈائری میں لکھی تھی اور ڈائری میری جیب میں تھی۔ میری ڈائری کمال کی تھی۔ اے فور سائز کا کاغذ لیتا۔ موڑ کر آٹھ ٹکڑے کرتا اور درمیان سے سٹیپل کر دیتا۔ ڈیوٹی کے دوران گاڑی میں بیٹھے بیٹھے جہاں کہیں کوئی اچھا مصرع یا پورا شعر وارد ہو جاتا ’ ڈائری میں لکھ لیتا۔ کسی شعری نشست میں غزل سنانے کی ضرورت پڑتی تو جیب سے ڈائری نکالتا اور غزل پڑھ دیتا۔ دوست شاعر تلملاتے۔

”اسلام عظمی‘ تم ایک درہم کی جیبی ڈائری کیوں نہیں خرید لیتے۔“

”ڈائری پلاسٹک کے کور کی وجہ سے چبھتی ہے۔“

کوئی کچھ بھی کہے۔ غزل اچھی ہونے میں ڈائری کا کمال نہیں ہوتا۔ کمال لفظوں کے برتاؤ سے ہوتا ہے۔ شعر میں ایک لفظ کی تبدیلی شعر کا مزاج اور مرتبہ بدل دیتی ہے۔ میں نے جیب سے ”ڈائری“ نکالی اور غزل سنادی۔

ہر قدم خواہش اثبات سے ڈر لگتا ہے
کیا سفر ہے کہ عبادات سے ڈر لگتا ہے

خالد احمد نے غزل سنی اور کہا ”میں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ تم شاعر ہو چکے ہو۔ شاعر ہو جانے کی شاباشی میں اپنی غزل میں میری طرف سے بھی ایک شعر ڈال دو۔“

شعر یہ تھا۔

موجزن زیرِ زمیں زلزلہ آ گئیں موسم
سنگ و آہنگ عمارات سے ڈر لگتا ہے

....

اپنی یاداشتوں کے مجموعے ”آؤٹ سائیڈر“ میں بھی میں نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر کسی نے اس بات کا نوٹس نہیں لیا۔ مطالعہ شاید لکھاریوں کی ضرورت نہیں رہا۔ کتاب پیش کرنے پر عام لکھاریوں کی بڑی سے بڑی کرم فرمائی یہ ہوتی ہے۔ وہ کتاب کے صفحات اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اور پھر فرماتا ہے۔

”کتاب خوب ہے مگر پروف ریڈنگ ٹھیک

سے نہیں ہوئی۔''

مزے کی بات یہ ہے کہ وہی غیر ادیب کتاب پڑھتا ہے۔ اچھے جملے اُسے حفظ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے پسندیدہ جملے دوستوں کو سنا کر خوش ہوتا ہے۔ اچھا جملہ یا اچھا شعر صدقہ جاریہ ہے۔

اچھا قاری کتاب میں کتابت کی ''غلطی'' نہیں نکالتا۔ اس کا ذہن درست لفظ تک آپ ہی آپ پہنچ جاتا ہے۔ کبھی کبھار ایسی قسم کی ماہرانہ رائے پر رونا آتا ہے۔

ایک پرانا ادبی لطیفہ ہے۔ ایک جید ادبی رسالے کا مدیر نے کسی دوسرے رسالے کے مدیر کو اپنا تازہ شمارہ دکھایا۔ اُس نے رسالے کے کچھ اوراق پڑھے۔ پھر فرمایا۔

''ٹائٹل خوبصورت ہے۔''

رسالہ پیش کرنے والا مدیر تلملا کر رہ گیا۔

جب ''ٹائٹل خوبصورت ہے'' کہنے والے مدیر نے جب اپنے رسالے کا تازہ شمارہ اُس مدیر کو دکھیا تو اس نے بھی رسالے کی ورق گردانی کی۔ پھر کہا۔

''تمھارے شمارے کا تو ٹائٹل بھی اویں ای اے۔''

ایک سنی سنائی بات یہ بھی ہے۔ کسی شاعر کا تذکرہ چھڑا تو کسی نے کہا ''چھوڑو یار۔ اس کے پاس گنتی کی چھے غزلیں ہیں اور دنیا بھر میں مشاعرے پڑھ آتا ہے۔ اس کے پاس بارہ غزلیں ہوتیں تو اس نے چاند پر بھی مشاعرہ پڑھ آنا تھا۔''

جملہ کہنے والے کا اپنا شعری مجموعہ شائع ہوا تو چھے غزلوں والے شاعر نے کسی سے کہلوا دیا۔

''اس شعری مجموعے میں تو ایک بھی کام کا شعر نہیں۔ کمال دیکھو۔ اسے پھر بھی غیر ملکی مشاعروں میں بلایا جانے لگا ہے۔''

ایسے لطائف تو معاصرانہ چشمک میں بنتے رہتے ہیں۔ ادھر ادھر کی سچی جھوٹی کہانیوں کے بعد خالد احمد کی طرف لوٹتے ہیں۔ پھر میں نے خالد احمد سے 'فنون' کو ارسال کی جانے والی اپنی لمبی ردیف والی غزل کے بارے میں پوچھا کہ وہ فنون میں کیوں شائع نہیں ہوئی۔ اس غزل کا ایک شعر تھا۔

بس کوئی دیر میں ساتھ ہو جائیں گی دور اندیشیاں
دل کی آوارگی چار دن کے لیے اور پھر الوداع

غزل کی ردیف ''چار دن کے لیے اور پھر الوداع'' تھی۔ خالد احمد نے جواب دیا ''غزل ٹھیک ہے مگر فنون نے چھاپ دی تو اگلے ماہ ایسی لمبی ردیف والی غزلوں کی لمبی لائن لگ جائے گی۔''

خالد احمد کی بات غلط نہ تھی۔ ہر مدیر کی مجبوریاں ہوتی ہیں اور پھر اس کا استحقاق بھی بنتا ہے۔

[جاری ہے]

اُردو ادب کا سفیر مشتاق دربھنگوی

سید طاہر شیرازی

مشتاق دربھنگوی کا شعری ادبی سفر کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ اردو ادب کی تمام اصناف پر مہارت بے مثال رکھتے ہیں۔ غزل کا میدان ہو، حمد، نعت، منقبت، نظم، قطعہ یا رباعی ہو ان کا اظہارِ سخن اور اسلوب اپنی پہچان آپ ہے۔ ان کے شعروں کے اندر شعریت دل موہ لیتی ہے اور شعروں کی چاشنی جو انسان کے اندر مٹھاس پیدا کرتی ہے یہ انھیں کا خاصا ہے۔ شاعر جو معاشرے کا اینیلسز کرتا ہے اُس سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں اُنھیں شعروں کا موضوع بنا کر صفحہ قرطاس پر لے آتا ہے۔ جس سے لکھنے والے کا مشاہداتی تجزیہ اُس دور کے تاریخی واقعات و آثار کی بنیاد بنتا ہے۔

مشتاق دربھنگوی کی شاعری میں معاشی، معاشرتی سیاسی، سماجی، جمالیاتی اور طبقاتی رجحانات کے موضوع پائے جاتے ہیں جس سے شاعر کے مطالعاتی کینوس کا ادراک ہوتا ہے۔

ان کی نعت سے چند اشعار اور غزل سے کچھ اشعار بطور حوالہ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تا کہ میری کی گئی بات

مستند ہو سکے۔

نعت سے چند اشعار:

ہے میرے دل میں بسی عظمت رسولؐ اللہ کی
رات دن میں کرتا ہوں مدحت رسول اللہ کی

ہو گئیں اس کو میسر دو جہاں کی نعمتیں
جس کو بھی حاصل ہوئی قربت رسول اللہ کی

مدتوں سے ہے یہی مشتاق میری آرزو
خواب میں دیکھوں کبھی صورت رسول اللہ کی

....

غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کھلے ہیں پھول ادب کے جس پہ وہ دامن نہ بیچیں گے
بلا سے کچھ بھی ہو نغموں کا ہم گلشن نہ بیچیں گے

نظر آتی ہے جس میں زندگی کی موہنی صورت
کسی قیمت پہ ہم اے دوست وہ درپن نہ بیچیں گے

قسم کھائی ہے ارباب قلم کے روبرو
ہم میٹھی میٹھی لو نے اندر سے ایک نئی زندگانی بخشی

....

مشتاق دربھنگوی خوب صورت شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ محقق، مؤلف، مصنف، کالم نگار اور بہت سے کمالات کا مالک ہے۔

اُن کی ترتیب دی گئی آل ورلڈ ڈائریکٹری "گوش بر آواز" ایک بہت بڑا عالمی ادبی کارنامہ ہے۔ جو شاعروں، ادیبوں اور فنونِ لطیفہ سے جڑے لوگوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ اور ایک حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

جس میں ادباء سے رابطے کے تمام بنیادی ذرائع موجود ہیں۔

شاعر کا قلمی نام بمعہ تصویر، ڈاک کا مکمل پتہ، ای میل ایڈریس اور لکھاری کا فون نمبر بھی دیا گیا تاکہ رابطے میں کسی بھی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

مشتاق دربھنگوی کا یہ کارنامہ اہم اور قابل تحسین ہے۔

میں اُن کو اس عظیم کارنامے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

میری یہ دعا ہے کہ مشتاق دربھنگوی اسی طرح پیار کی خوشبو بانٹتے رہیں اور محبتوں کا یہ گلشن یوں ہی کھلا رہے۔ اس کی مہک سے ادب کی دنیا یونہی ہنستی بستی رہے۔

میری طرف سے یہ شعر مشتاق دربھنگوی صاحب کی نظر:

جو لوگ مری ذات کے قائل نہیں اب
مرنے کے بعد طاہر وہ قیمت لگائیں گے

☆☆☆☆☆

جادو بھری شام اور نسیمِ سحر

نسیمِ سحر سے میرا غائبانہ تعارف تو کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ البتہ ان سے معانقہ کرنے کی سعادت لگ بھگ پندرہ برس پیشتر نصیب ہوئی۔ اب تک تواتر سے لکھنے والے جو ادبا و شعرا میری نظر سے گزرے، ان میں نسیم بھی نمایاں قدمچے پر کھڑے ہیں۔ یہ بیماری کی حالت میں بھی قلم کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ عمر رسیدگی کے باعث اردو ادب کی کئی اصناف میں ان کا رہوارِ قلم سرپٹ بھاگتا ہے۔ نعت، غزل، خاکے، مضامین، ہائیکو، تنقیدی شذرات، تبصرے، خطوط، الغرض اردو ادب کی آبرو میں اضافہ کرنے میں نسیم سحر اپنا کردار بخوبی نبھا رہے ہیں۔ ستائیس کتابوں کا یہ مصنف کہنہ سالی کے باوصف ادبی دنیا میں اپنے ہونے کا بھرپور ثبوت دیتا رہتا ہے۔ کبھی غائب نہیں ہوتا۔ بیشتر ادبی رسائل میں نسیمِ سحر حاضری لگواتے ہیں۔ بسا اوقات میں سوچتا ہوں کہ اتنا کچھ لکھنے کے لیے نسیمِ سحر اوقاتِ کار کو کیسے تقسیم کرتے ہوں گے۔ آخر دنیا داری کے امور بھی تو نبھانا پڑتے ہیں۔ گمان اغلب یہی ہے کہ دیگر دنیوی مصروفیات ان کے بے پناہ تخلیقی وفور کے آگے بے بس اور عاجز ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بہت بڑی قربانی کی بات ہے۔ اور ایسا ہونا غیر مشروط وابستگی کے بغیر ممکن نہیں ہوا کرتا۔ عہدِ موجود میں اردو ادب سے ایسی گہری وابستگی رکھنے والے خال خال ہی ہیں۔

اس وقت میرے ہاتھ میں ان کی تازہ ترین تخلیق "جادو بھری شام" ہے۔ یہ غزلیہ مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے شاعری پر ستر کے قریب مجموعہ جات شائع ہو کر ادبی دنیا میں قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں نسیمِ سحر اس گل دستہ اشعار میں کتنے رنگوں

طالب انصاری

کے پھول لے کر آئے ہیں۔ گفت گو آغاز کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ نسیم سحر اپنی طبع میں نہایت سنجیدہ، مہذب اور شائستہ ہیں۔ مجھے یہ پہلی ملاقات میں کم گو اور کم آمیز بھی محسوس ہوئے۔ طبع کی یہ خصوصیات عام طور پر انسان کی گفت گو میں اور اگر وہ تخلیق کار بھی ہو تو لاشعوری طور پر اس کی تخلیقات پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں پُرسکون دریا کا سا بہاؤ ہے۔ یہ جھاگ اڑاتا، پتھروں سے سر ٹکراتا ہوا پُرشور دریا نہیں ہے، جو کناروں سے باہر اچھلا پڑتا ہے۔ نسیم سحر جدیدیت کی رو میں بہتے ہوئے روایت کے کناروں کے پابند ہیں۔ ان کناروں سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ غزل ونظم میں دہرائے گئے مضامین سے ہٹ کر تازہ کاری کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ کتاب کا انتساب انھوں نے ان تمام غزل گو شعراء و شاعرات کے نام کیا ہے "جنھوں نے غزل عورتوں سے باتیں کرنے کا نام ہے، جیسے پامال کلیشے کو رد کر کے اپنی غزلوں میں زندگی اور مابعد کے موضوعات کو تخلیقی رنگ میں سمو کر صنفِ غزل کو وسعت دی اور اسے دوام بخشا"۔ اس انتساب سے واضح ہوتا ہے کہ نسیم سحر بھی ادب کے دستر خوان پر چبائے ہوئے نوالوں کو پرے ہٹانے کا رجحان رکھتے ہیں۔

سخن وری میں انھیں ایسی قدرت حاصل ہے کہ ایک ہی ردیف، قافیے اور بحر میں دو غزلہ، سہ غزلہ اور چہار غزلہ کلام بھی ان کے ہاں موجود ہے اور ہر غزل میں محدود اشعار پر اکتفا نہیں کرتے۔ ناصر کاظمی کے معروف مصرع "جب میں نے لکھنا سیکھا تھا" پر نسیمِ سحر نے چھ غزلیں کہی ہیں اور کوئی غزل ایسی نہیں ہے، جو قابلِ توجہ نہ ہو۔ شعر گوئی پر یہ دست رس مسلسل ریاضت اور طویل فنی سفر کی دین ہے۔

ان کی فکری جہات کے کئی رنگ ہیں۔ اگرچہ غالب رجحان درونِ ذات کی سیر اور رومانویت ہے، مگر ہر باشعور فن کار کی طرح ان کے ہاں اپنے اردگرد کے ماحول اور معاشرتی و سیاسی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ پل پل ملکی و سیاسی حالات میں آنے والی تبدیلیاں نسیمِ سحر کی شاعری پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش سے سرسری نہیں گزرتے۔ ہر منظر کو دل و دماغ میں تہیج پیدا کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ چوں کہ نسیم سحر صاحب کو دیارِ شعر میں بسرام کیے ایک زمانہ ہو گیا ہے، اس لیے میں اگر ایک ایک موضوع پر اشعار لکھنے لگوں تو اشعار کی قطار لگ جائے گی۔ صرف زیرِ نظر مجموعہ سے معروضی حالات کی نشان دہی کرتے ہوئے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کرنا ضروری ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ نسیم سحر کے فن شاعری میں عصرِ موجود کے مسائل کیسے جگہ بناتے ہیں:

سوچا تھا ایسا ہو گا، پر ایسا نہیں ہوا
شب تو گزر گئی ہے، سویرا نہیں ہوا

خوشی منائے نہ فوجوں کی واپسی پہ کوئی
نیا محاذ بھی تیار ہونے والا ہے

سمجھ رہے ہو یہاں خود کو تم بہت محفوظ
مگر یہ قلعہ تو مسمار ہونے والا ہے

بنامِ امن و اماں کون مارا جائے گا
نہ جانے آج یہاں کون مارا جائے گا

صحنِ گلشن کو جلا دینے کی تیاریاں ہیں
اب کمی ہے تو فقط ایک ہی چنگاری کی

زمیں تو چھین کے جاگیروار لے بھی گیا
مگر میں آج تک اس کا لگان بھر رہا ہوں

فضا میں فاختہ کوئی نظر نہیں آتی
لہو کی بارشیں برساتی کائنات میں ہوں

جو شخص یہ کہتا ہے سب اچھا ہے یہاں پر
لے جا کے اسے شہر کے حالات دکھاؤ

....

وقت کے اسرار کو گرفت میں لانے کی ہر عہد میں کوشش کی گئی ہے۔ مختلف فلسفیوں نے اس موضوع پر اپنی اپنی فکر کے مطابق نکتہ آفرینی کی ہے۔ فلسفیوں کے نزدیک وقت ایک تسلسل کا نام ہے، جو ماضی، حال اور مستقبل پر مشتمل ہے۔ وقت انسانی شعور کا حصہ ہے۔ بعض اسے حرکت اور تبدیلی سے منسلک کرتے ہیں۔ آئن سٹائن کے بقول وقت مشاہدہ کرنے والے کی حرکت اور کشش ثقل کے اثرات کے تحت مختلف ہو سکتا ہے۔ شاعر اپنے انداز اور فکر کے مطابق وقت سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ نسیم سحر نے وقت کو کس شاعرانہ انداز سے دیکھا۔ آئیے ہم بھی دیکھتے ہیں:

حدودِ وقت کا قائل نہیں میں
ہر ایسی حد سے آگے جا رہا ہوں

مشکل ہے اگر لمحہء موجود میں رہنا
ہم کیوں نہ کسی اور زمانے میں چلے جائیں

کچھ نہیں ماضی اور مستقبل
زندہ لمحہ تو صرف حال کا ہے

نہ کوئی لمحہء ماضی، نہ عہدِ آئندہ
بس ایک لمحہء موجود کائنات میں تھا

....

نسیم سحر کئی دہائیوں سے شعر و ادب کے ساتھ منسلک ہیں۔ طویل فنی سفر کی وجہ سے ان کے ہاں الفاظ کو برتنے کا سلیقہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ نسیم سحر کے ہاں کئی بار دہرایا گیا مضمون بھی نئے پہلو کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ موت ایک سربستہ راز ہے۔ اس موضوع پر بھی فلسفیوں اور دانش وروں نے اپنی اپنی فکر کے مطابق نکتہ آفرینی کی ہے۔ اردو شاعری میں اس موضوع پر متعدد اشعار موجود ہیں۔ نسیم سحر بھی اس اہم موضوع سے کیسے غافل رہ سکتے تھے۔ پہلے مشہور شعرا کے موت کے موضوع پر اشعار ملاحظہ فرمائیں:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
(میر تقی میر)

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا
(برج نرائن چکبست)

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے
(شوق لکھنوی)

موت کو سمجھیں ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی
(علامہ اقبال)

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
(مرزا اسداللہ خاں غالب)

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
(احمد ندیم قاسمی)

موت اک حرفِ غلط کی طرح آ جاتی ہے
زندگی نام ہے تحریر کا، ہونے کا نہیں
(جون ایلیا)

چوں کہ نسیم سحر کے ہاں جدید اسلوب کو اپنانے کی شعوری کوشش موجود ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے شعری اسلوب میں اس موضوع سے کیسے نبرد آزما ہوتے ہیں:

ملتوی اور سبھی کام تو کر سکتا ہوں
رک نہ پاؤں گا جو اوپر سے بلاوا آیا

مل جائے گی رہائی بھی قیدِ حیات سے
پہلے تو اپنے ہونے کے سب واجبات بھر

بدن تو اک کرائے کا مکاں ہے
کروں گا خندہ پیشانی سے خالی

تمہارے پاس رک سکتا تھا لیکن
کسی مقصد سے آگے جا رہا ہوں

اگر اس حد سے آگے کچھ نہیں ہے
تو کیوں اس حد سے آگے جا رہا ہوں

کچھ اُدھر کی بھی خبر ہے کہ نہیں
یہ تو تھا عالمِ فانی سائیں

عین ممکن ہے میں چلا جاؤں
گرچہ اب تک تو ہوں یہیں موجود

جب بھی آزاد ہوا خاک سے میں
جا کے مل جاؤں گا افلاک سے میں

....

نسیم سحر کے شعری اسلوب میں ہجر و ہجرت کی المیاتی سطح بھی پورے قد پر استوار ہے۔ انسانی معاشرے میں بسلسلۂ روزگار یا دیگر عوامل و حوادث کی وجہ سے بسا اوقات اپنے گھر سے دوری اختیار کرنا پڑتی ہے یا اپنے وطن سے نقل مکانی بھی کرنا پڑ سکتی ہے۔ حساس تخلیق کار اس المیے کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ نسیم سحر بھی ایسے ہی حساس فن کاروں میں سے ہیں۔ اس حسیت کے ضمن میں جو اشعار مجھے پسند آئے، انہیں درج کرتا ہوں:

مضمحل تھے در و دیوار مری ہجرت سے
کبھی دیوار، کبھی در سے بلاوا آیا

فیصلہ ملتوی کرنا پڑا ہجرت کا نسیم
مجھ سے جب گھر کے در و بام نے سرگوشی کی

یہی تھی شرط کہ لمبی اڑان بھرنی ہے
سو لے کے ٹوٹے ہوئے بال و پر گئے ہم بھی

تو کیا تم اپنا سفر ملتوی ہی کر دو گے
گھنا جو سایہء اشجار ہونے والا ہے

....

نسیم سحر غزل کو نیا رنگ دینے کے لیے اور معانی دیگر کی جستجو میں نہ صرف جہانِ درون میں گھومتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ آفاقی منطقے بھی ان کی دست رس میں رہتے ہیں۔ یوں ان کی غزل کا خمیر ہر دو کیفیات اور محسوسات سے تیار ہوتا ہے۔ شعری اظہار میں دیگر اوصافِ شعر کے ساتھ شاعرانہ سرشاریوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ خارجی عوامل کے ساتھ وارداتِ دل کو بھی ایسی ہنر مندی سے شعری پیرایہ عطا کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کا دکھ اپنا دکھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ نسیم سحر کے کچھ اشعار پڑھیے۔ آپ بھی انہیں میری طرح پسند کیے بغیر نہیں رہیں گے:

آستینیں تو پھٹ چکی ہیں نسیم
ان میں ہیں مارِ آستیں موجود

پردہ گرا دو ، اب یہ تماشا لپیٹ دو
اُکتا چکے ہیں سارے تماشائی تخلیہ

وہ تو کب کا بیت چکا تھا
میں جس موسم میں رہتا تھا

کہاں اب ان کی تعبیریں ملیں گی
ہمارے خواب کینسل ہو گئے ہیں

اک شہادت کی روایت کے تسلسل میں کیا
اپنے بیٹے کی طرف آتے ہوئے تیرے عشق

اس کے اندر خواب ہے اک اور بھی
خواب جو تعبیر ہوتا جا رہا ہے

کوئی دلاسا نہیں چاہیے نسیم سحر
جو رنج دل میں بھرا ہے تو بس بھرا ہوا ہے

مجھے کسی نے یہ دی ہے خبر، میں زندہ ہوں
تو کیا یہ سچ ہے نسیمِ سحر، میں زندہ ہوں؟

قیس اب تیرے جنوں کی ہے یہی آخری حد
اس سے آگے ہیں حدیں میری عمل داری کی

قیس کے عشق کو زوال کہاں
میں جو ہوں اس کا جانشیں موجود

....

چلتے چلتے ”میں زندہ ہوں“ والی ردیف میں تکرارِ لفظی کی مثال بھی دیکھیے اور سر دھنیے۔ اگرچہ نسیم سحر کے ہاں تکرارِ لفظی کی دیگر مثالیں بھی ہیں۔ میں نے اس شعر کو اس لیے منتخب کیا کہ اس شعر میں پانچ الفاظ کی تکرار نے پر کیف صوتی سماں پیدا کیا ہے:

مجھے ڈبو نہیں پایا بھنور نسیم سحر
مجھ ڈبو نہیں پایا بھنور میں زندہ ہوں

....

میں ”جادو بھری شام میں“ نسیم سحر سے ملاقات کر چکا ہوں اور کیف و انبساط کے عالم میں یہ کہہ کر اٹھ رہا ہوں کہ نسیمِ سحر صاحب آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی

☆☆☆☆☆

جناب فخرالدین بلے...... ایک عظیم شخصیت اور تہذیبی دبستان

جنابِ فخرالدین بلےؔ محض ایک عظیم آدمی نہیں بلکہ ایک زندہ تہذیبی ادارہ تھے۔ یہ خیال اب محض تعارف نہیں رہا بلکہ دعوتِ فکر ہے کہ فخرالدین بلےؔ کو ایک ایسے مجموعی وجود کے طور پر پڑھا جائے جو بظاہر ایک فرد تھے مگر عمل و اثر میں ایک پوری ثقافتی یونیورسٹی تھے۔ پروفیسر عاصی کرنالی کے وہ الفاظ درست طور پر اس خیال کو سمیٹ لیتے ہیں: ''فخرالدین بلےؔ ایک شخص کا نہیں، ایک یونیورسٹی اور ایک تہذیبی ادارے کا نام ہے۔'' یہ ایک جملہ اپنے اندر وہ تمام کائنات سمیٹے ہوئے ہے جس نے اُن کو دورِ حاضر کے اُن ادبی قائدین میں کھڑا کیا جو محفل، مطالعہ، تحقیق اور سماجی خدمت کو ایک ہی سانس میں جوڑ دیتے تھے۔

علی گڑھ سے شروع ہونے والا یہ نصابی و تربیتی سفر محض تعلیمی ریکارڈ نہ رہا بلکہ فکری اور تدریجی سرمایہ بن کر نکلا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جیالوجی میں ایم۔ایس۔سی کی سند کے ساتھ اُن کے تعلیمی تجربے نے جو سیاسی و ادبی مشقیں جنم دیں —— طالب علمی میں ادارت، طلبہ جرائد کی سرپرستی، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت —— یہ سب بعد میں اُن کی عملی زندگی کے مراکز بن گئیں۔ یہی تربیتی سرمایہ اُن کی زندگی کے ہر مرحلے میں ایک چراغِ رہ گزر کی مانند جلتا رہا: نصاب سے باہر کا وہ درس جو اقدار، محنت، زہد و سخا اور انسان دوستی کو عملی شکل دیتا تھا۔

جن اقدامات نے فخرالدین بلےؔ کو واقعی ایک ''ادارہ'' بنا دیا وہ اُن کی انتظامی اور ثقافتی کوششیں تھیں: اطلاعات و تعلقات عامہ، سیاحت، آرٹس کونسلوں کی تجدید، سوشل ویلفیئر اور سمندر پار پاکستانیوں کے امور

منظر حسین اختر

تک اُن کی متنوع خدمات۔ راولپنڈی اور ملتان آرٹس کونسل کو فعال اور باوقار بنانا، ملتان میں پچیس روزہ ''جشنِ تمثیل'' جیسے تجربات کا انعقاد — یہ سب صرف تقریبات نہ تھے بل کہ تہذیبی شمعیں تھیں جنھوں نے فن اور اسٹیج کو تقویت دی اور شہری ثقافت کے دامن میں نئے رنگ درج کیے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں محسنِ فن اور Man of the Stage کے القابات ملے۔

یہی ہمہ جہتی فطرت اُن کے ادبی و صحافتی کاموں میں بھی جھلکتی تھی: دی یونین اور ماہنامہ جھلک سے شروع ہو کر بہاولپور ریویو، ماہنامہ اوقاف، ہم وطن، یارانِ وطن، نوائے بلدیات، لاہور افیئرز، مسلم لیگ نیوز، ہمارا ملتان — ایک پوری قطارِ صحافتی و ادبی اجرا آت — یہ رسائل اور جرائد محض کاغذ نہ تھے، یہ وہ آئینے تھے جن میں سماج اپنی صورت دیکھتا، بحثیں جنم لیتیں اور ادبی سوالات نئے زاویوں سے کھلتے۔ ''قافلہ'' نامی ادبی و ثقافتی انجمن قائم کر کے انھوں نے لاہور، ملتان اور بہاولپور میں باقاعدہ بزم سجائی۔ یہ محافل اُن کے ذوق، ان کی قیادت اور ان کے برادرانہ رویّے کا استعارہ تھیں۔ یہ محفلیں محض ادبی نشستیں نہ تھیں بل کہ تہذیب کے نئے دروازے کھولنے والی دانش گاہیں تھیں۔

روحانی اور موسیقیاتی تجربات میں اُن کا نیا قول ترانہ — ''من کنت مولاہ فہٰذا علی مولاہ'' — امیر خسرو کے بعد ایک نئی صوتی تہذیب کے طور پر سامنے آیا۔ ریڈیو پاکستان ملتان نے اس کی دُھنیں تیار کیں، اور علامہ سید احمد سعید کاظمی نے اسے قوالی کے تناظر میں خسرو کے کام کا تکملہ قرار دیا۔ محقق سید کلبِ حسن نونہروی نے اس قول ترانے کی شرح و تحقیق کے ذریعے اس کے معنوی اور تاریخی پہلو کھول دیے؛ یوں یہ ترانہ محض نظم نہ رہا بل کہ عرفانِ ولایت اور ثقافتی امتزاج کی ایک درسگاہ بن گیا۔

مہمان نوازی اور محفلوں کی گرم جوشی اُن کی شخصیت کا لازمی حصہ تھی۔ اُن کے گھر کی دیواریں آج بھی ان محفلوں کی بازگشت سناتی ہیں — شام سے لے کر رات گئے تک کلام، تنقید، تاریخ اور فنونِ لطیفہ پر سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ ان محافل میں احمد ندیم قاسمی اور اختر حسین جعفری کا خصوصی مقام تھا؛ ان کی دوستی محض ادبی رفاقت نہیں تھی بل کہ ایک گہرے برادرانہ تعلق کی مانند تھی۔ اختر حسین جعفری جدید اردو نظم کے امام تھے، ایسے عہد ساز شاعر جن کے اسلوب کو ان کے معاصرین اور بعد کے شعرا نے نہ صرف فالو کیا بل کہ اپنی فکری زمین پر اس کے نقوش ثبت کیے۔ ان کی شعری عظمت ان کے عہد میں ہی تسلیم کر لی گئی تھی۔ ان کی ہر نظم، ہر لائن گویا ایک عہد کی شہادت تھی۔ ان کا کلام اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نظریہ ساز، سرو قامت اور وقت کے شعور کو بیدار

کرنے والے شاعر تھے — ایسے شاعر جن کا پورا زمانہ ان کی گواہی دیتا ہے۔
اسی گھرانے میں خالد احمد، نجیب احمد، امجد اسلام امجد، حفیظ تائب، ابصار عبدالعلی اور دیگر نابغۂ روزگار اہلِ قلم بھی شریک ہوتے۔ شوبز کے بڑے نام جیسے اداکار محمد علی اور دیگر فنونِ لطیفہ سے وابستہ افراد بھی فخرالدین بلّے کی دعوت کو اعزاز سمجھتے۔ ان محافل میں ادب، فن اور زندگی ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے چلتے تھے۔ اگر ہم جدید فکری زبان میں ان محافل کو دیکھیں تو یورگن ہابرماس کے ''عوامی منظرنامہ'' (public sphere) کے تصور میں یہ محفلیں جیتی جاگتی مثال تھیں۔ ریمونڈ ولیمز کے مطابق یہ سرگرمیاں محض ادب نہ رہ کر ''ثقافت بطور زندہ طرزِ عمل'' کا مظہر تھیں۔ ٹی۔ایس۔ ایلیٹ کے مضمون Tradition and the Individual Talent کے تناظر میں دیکھا جائے تو فخرالدین بلّے روایت اور جدیدیت کے حسین امتزاج تھے۔ ایڈورڈ سعید کے ''بین الثقافتی مکالمے'' (cross-cultural dialogue) کا عملی عکس بھی ان کے ہاں دکھائی دیتا تھا۔ ہارولڈ بلوم کی Anxiety of Influence کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نوجوان شعرا کی ادبی بے چینی کو کم کر کے انھیں اعتماد اور تخلیقی جرات عطا کی۔

ان کی شاعری میں کلاسیکی بحر و بیان اور جدید حساسیت کا امتزاج ملتا ہے — ایسا امتزاج جسے عالمی ادب میں ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس جیسے بڑے شعرا نے بھی تلاش کیا۔ ان کی غزلیں، قطعے اور بڑے قالب کے تجربات آج بھی ریختہ اور دیگر آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔ یہی ان کے شعری ورثے کی بقا ہے۔ 28 جنوری 2004 کو جب وہ اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے تو اُن کی جسمانی موجودگی ختم ہو گئی، مگر اُن کا قافلہ — کتابیں، جرائد، محفلیں، اور اُن کا قولِ ترانہ — آج بھی ایک ثقافتی گونج کے طور پر زندہ ہے۔ فخرالدین بلّے ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ ادب محض متن نہیں؛ ادب زندگی کی تنظیم ہے، محفلوں کی ترتیب ہے، اور بالآخر سماجی ہم آہنگی کا ذریعہ ہے۔

آخر میں وہی بات دہرائی جا سکتی ہے: فخرالدین بلّے واقعی ایک شخص نہیں، ایک تہذیبی ادارہ تھے — ایک ایسا ادارہ جو کتاب، محفل، ترانہ، مجلسِ عمل اور انسانی رابطہ میں ایک ہی سانس لیتا تھا۔ اُن کے تجربے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب فن خیر کا ہم سفر بن جائے تو اس کی خوشبو اور روشنی صدیوں میں بکھرتی رہتی ہے۔ وہی رہنمائی، وہی سخاوت اور وہی محفلیں آئندہ نسلوں کے لیے نصابی اور روحانی سبق بن کر رہیں گی۔

☆☆☆☆☆

شکیب جلالی کی شاعری زندگی اور خودکشی

خالد سہیل / امیر حسین جعفری

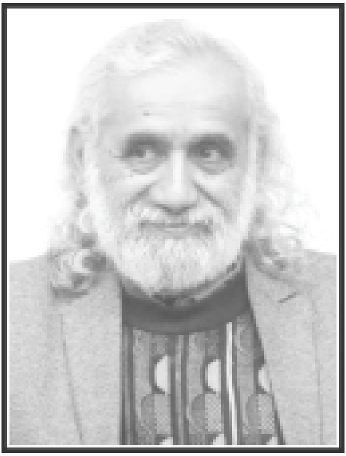

قبلہ و کعبہ امیر حسین جعفری صاحب

میں آج کل شکیب جلالی کے مجموعہ کلام

"روشنی اے روشنی"

کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ چونکہ وہ آپ کے محبوب شاعر ہیں تو کیا آپ مجھے ان کی زندگی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟

کیا یہ بات درست ہے کہ انھوں نے خودکشی کی تھی؟

آپ چونکہ اردو شاعری کے بارے میں ایک صاحب الرائے ادیب اور نقاد ہیں اس لیے میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی ان کی شاعری کے بارے میں کیا رائے ہے؟

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا ادبی دوست

خالد سہیل

امیر جعفری کا خط

قبلہ خالد سہیل صاحب

آپ کا خط ملا۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ میرے پسندیدہ شاعر شکیب جلالی کی زندگی اور شاعری کے نفسیاتی پہلو پر کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے دسمبر 1992 میں الفضل ریسٹورنٹ کی وہ شام آج تک یاد ہے، میں سگریٹ سلگائے خاموش سا بیٹھا تھا

کہ جناب خالد احمد اور جناب نجیب احمد تشریف لائے، میری خاموشی کو بھانپ کر جناب خالد احمد کہنے لگے۔

حسبِ معمول آپ خاموش ہیں! خیریت تو ہیں ناں

جواباً میں نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

جناب نجیب احمد نے اشارہ کیا اور انہیں کچھ کہا تو خالد صاحب کہنے لگے

نجیب احمد ،اختر حسین جعفری صاحب کا انتقال کس مہینے میں ہوا تھا۔

نجیب صاحب قدرے توقف کے بعد مخاطب ہوئے

جعفری صاحب کا انتقال ہوئے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد گفتگو کا موضوع تبدیل ہو گیا اور خالد احمد صاحب دیگر شرکا سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

گو جناب اختر حسین جعفری کے وصال کو تقریباً چھ ماہ ہو گئے تھے مگر میرے لیے ان کی موت کا غم بالکل تازہ تھا۔ میں بظاہر وہاں موجود تھا مگر کسی کو بھی دستیاب نہیں تھا میری اس لاتعلقی کو بھانپتے ہوئے جناب خالد احمد دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئے

تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب تم خاموش رہو گے

میں نے مسکرا کر خالد صاحب کو دیکھا تو خالد صاحب کہنے لگے

اب میں دیکھتا ہوں کہ تم کتنی دیر اور خاموش رہتے ہو لو یہ شعر سنو

وہ خموشی انگلیاں چٹخا رہی تھی اے شکیب
یا کہ بوندیں بج رہی تھیں رات روشندان پر

....

یہ شعر سن کر میں حیرت زدہ سا رہ گیا اور بے اختیار مخاطب ہوا کہ یہ کس کا شعر ہے؟

خالد انکل مکرر ارشاد، میری سنی ان سنی کرتے ہوئے اگلا شعر پڑھتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

آج بھی شاید کوئی پھولوں کا تحفہ بھیج دے
تتلیاں منڈلا رہی ہیں کانچ کے گلدان پر

....

میں قدرے بے چین ہو کر کہنے لگا

خالد انکل یہ کون شاعر ہے؟

مجھے مکمل نظر انداز کرتے ہوئے انھوں نے شاعری پڑھنی شروع کر دی:

گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

....

واہ واہ واہ کیا کہنے خالد صاحب واہ

ذرا نہ موم ہوا پیار کی حرارت سے
چٹخ کے ٹوٹ گیا دل کا سخت ایسا تھا

....

کیا کہنے واہ واہ

مجھے بے اختیار داد دیتے دیکھ کے کہنے لگے کہ نجیب میں دیکھتا ہوں کہ یہ کیسے خاموش رہتا ہے پھر مجھ سے مخاطب ہوئے امیر اور یہ شعر دیکھو:

ادھر سے گزرا تھا ملک سخن کا شہزادہ
کوئی نہ جان سکا ساز و رخت تھا

....

میں نے بے اختیار ہو کر کہا خالد انکل یہ کون شاعر ہے

تم نے سنا نہیں یہ ملک سخن کا شہزادہ تھا نہیں بل کہ یہی ملک سخن کا شہزادہ ہے

نجیب صاحب بھی خالد صاحب کے ساتھ شامل ہو گئے اور کہنے یہ شعر دیکھو:

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

....

میں حیرت کی تصویر بنا شاعری سن رہا تھا اور خالد صاحب مجھے شاعر کا نام بتانے کے بجائے صرف اشعار سنا رہے تھے آخر کار چار یا پانچ غزلوں کے بعد کہنے لگے۔

کیا آپ کو معلوم ہوا جدید تر شاعری کسے کہتے ہیں اس وقت بھی بہت سے شعرا یہاں موجود ہیں اور کچھ نہ کچھ لکھ کے بھی لائے ہوں گے، اور ان کے خیال میں وہ نئی غزل یا نظم لکھ کر لائے ہوں گے، ان کی شعری کاوش کو ہم تازہ غزل یا نظم تو کہہ سکتے مگر نئی ہرگز نہیں، نئی غزل تو شکیب جلالی کہتا تھا۔ بل کہ تم اسے جدید غزل کا امام بھی کہہ سکتے ہو۔ خالد صاحب کی گفتگو سن کر میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے، کیا شکیب صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟

وہ ابا کو بھی جانتے ہوں گے، ان کا مجموعہ کلام کہیں سے مل سکتا ہے؟

ان سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟

میرے سوالات سن کر خالد احمد کہنے لگے آپ ان سے مل کر کیا کریں گے۔ آپ کے والد کہا کرتے تھے شاعر سے ملاقات کی سب سے مناسب جگہ کتاب کا صفحہ ہوتی ہے ان سے کتاب کے صفحے پر ملاقات کریں اور جی بھر کے ان سے ملیں۔

ان کی کتاب کہاں سے مل سکتی ہے؟

کس پبلشر نے ان کی کتاب شائع کی ہے؟

میرا کام تھا آپ کو شاعر کا کلام سنانا۔

میرا کام ختم ہوا باقی جتنے سوالات ہیں آپ اپنے تایا جان (احمد ندیم قاسمی صاحب) سے کیجیے گا ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن انھوں نے ہی شائع کیا تھا بلکہ ان کی کتاب کا دیباچہ بھی انھوں نے ہی لکھا تھا۔

کتاب کا نام کیا تھا؟
روشنی اے روشنی
واہ
اگر آپ کا موڈ ٹھیک ہو گیا ہو تو اب ہم کوئی اور بات کرلیں؟
میں نے ہنستے ہوئے کہا جی کیوں نہیں
"روشنی اے روشنی" دل ہی دل میں شکیب صاحب کو ان کی شاعری اور کتاب کا نام پر داد دیتا رہا۔
اگلے دن اٹھتے ہی میں قاسمی صاحب کے دفتر مجلس ترقی ادب جا پہنچا اور ان سے "روشنی اے روشنی" کے حوالے سے سوالات کرنے لگا، جناب احمد ندیم قاسمی نے کہا شکیب جلالی انتہائی منفرد اور مختلف شاعر تھا تم اسے جدید تر شاعری کا امام بھی کہہ سکتے ہو میں خود بھی شاعر ہوں اور اکثر شعرا حضرات کسی دوسرے شاعر کو تسلیم کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ شکیب جلالی انتہائی منفرد اور انتہائی مختلف شاعر تھا یہ اردو شعری روایت کی بدنصیبی ہے کہ اسے زندگی بہت کم ملی اگر وہ کچھ برس اور زندہ رہ جاتا تو وہ اردو غزل کا دامن مالامال کر جاتا
ان کا انتقال کیسے ہوا؟
میرا سوال سن کر قاسمی صاحب خاموش ہو گئے، کچھ دیر کے بعد مخاطب ہوئے
شکیب صاحب نے خودکشی کی تھی، اس واقعے کی مزید تفصیلات بھی ہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو ان تفصیلات کو جاننے کی فی الحال کوشش نہ کرو، تم ابھی کم عمر ہو، اس عمر میں ان سوالات کا بوجھ اٹھانا ایک نامناسب عمل ہے، ہاں جو کام تم کر سکتے ہو وہ یہ ہے کہ شکیب جلالی کی شاعری کو پڑھو اور یہ جاننے کی کوشش کرو کہ فن شاعری میں وہ کیا شے ہے جو شعر کو نئی شناخت عطا کرتی ہے۔
ان کی کتاب کہاں سے مل سکتی ہے؟
میرے پاس لائبریری میں تھی میں دیکھتا ہوں میں نے ہی تو "روشنی اے روشنی" کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔ شکیب صاحب کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ خاتون نے یہ ذمہ داری مجھ کو سونپی تھی سو میں نے وہ ذمہ داری پوری کر دی۔
کیا اس کتاب میں ان کا کل کلام شامل ہے؟
نہیں جو قابل اشاعت تھا یا یوں کہہ لو جس کلام کو میں نے لائق اشاعت سمجھا میں نے شائع کر دیا۔ قاسمی صاحب قدرے توقف کے بعد مخاطب ہوئے
دیکھو امیر کسی بھی شاعر کا کل کلام اس قابل

نہیں ہوتا کہ وہ قابلِ اشاعت ہو۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے مجموعی طور پر تو وہ شاعری اچھی ہوتی ہے مگر اس شاعر کی کچھ شاعری ایسی بھی ہوتی ہے جسے ہم بے مثال شاعری کے درجے پر یا لازوال شاعری کے درجے پر بلاخوف تردید فائز کر سکتے ہیں، شکیب صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا ان کی کچھ شاعری تو ایسی اعلیٰ تھی کہ پڑھنے اور سننے والا حیرت زدہ رہ جائے اور کچھ شاعری ایسی تھی کہ وہ تھی تو مناسب مگر شکیب صاحب کے شایانِ شان نہیں تھی یوں سمجھ لوں وہ شاعری گر چھپ جاتی تو ان کے شعری قد میں اضافے کے بجائے اس میں کمی کا باعث بنتی، یہ میری رائے ہے، تمھارے والد مرحوم جناب اختر حسین جعفری کہتے تھے۔

نظم کی سب لائینوں کو یونیفارم ہونا چاہیے اگر ایک بھی برایٔٹ لائن نظم میں آجائے تو باقی نظم میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا نظم ہو کہ غزل کی شاعری اسے یونیفارم ہی ہونا چاہیے۔ جیسے شکیب صاحب کا یہ شعر ہے کہ

گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

اردو شعری روایت ایسے اشعار پر فخر کر سکتی ہے۔

میں نے کہا کہ کیا خوب صورت امیج ہے کہ درخت نے بازو کھول رکھے ہیں چاند سے ملنے کے لیے مگر کیسی نارسائی ہے عجب کیفیت کا حامل ہے یہ شعر، واہ

جس شعر پہ تم داد دے رہے ہو اس معیار کی حامل جو شاعری تھی وہ میں نے چھاپ دی اور جو شاعری میں نے نہیں چھاپی اسے نہیں چھپنا چاہیے تھا۔

مجھے ماورا کے دفتر سے روشنی اے روشنی مل گئی اور میں نے اس کتاب کا مطالعہ تقریباً ایک ہفتے میں مکمل کر لیا۔ کتاب کیا میرے ہاتھ آئی گویا ایک خزانہ مل گیا۔ اس کتاب کا مطالعہ میرے لیے کسی تخلیقی تجربے سے کم نہ تھا۔ میرے لیے نہ صرف ایک تخلیقی تجربہ تھا بل کہ روشنی اے روشنی کی شکل میں ایک نئی دنیا آباد تھی۔ رنگوں اور تصویروں کی دنیا، مگر ان تصویروں میں موت کا رنگ واضح طور پر دکھائی دیتا تھا۔ شاعری میں اتنی شدت، اتنا وفور، روایتی شاعری سے اس قدر مختلف، صحیح معنوں میں ایک جہان آباد تھا اس کتاب میں۔ میں اپنی یہ کیفیت جناب خالد احمد کو سنانا چاہتا تھا۔

میں لکشمی چوک میں واقع الفضل ریسٹورنٹ میں "روشنی اے روشنی"

تھامے پہنچا تو وہاں خالد احمد اور نجیب احمد

صاحبان کچھ نوجوان شعرا کے ساتھ موجود تھے۔میرے ہاتھوں میں کتاب دیکھ کر خالد صاحب مخاطب ہوئے،

کیا رائے آپ کی اس شاعری کے بارے میں؟

خالد انکل یہ شاعری نہیں ہے، کچھ باتیں ہیں جو شکیب صاحب نے اپنے قارئین کے ساتھ کی ہیں زندگی کے عمل کو دیکھنے کا بالکل الگ زاویہ ہے جسے قاری دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے، ان کے اشعار قاری کو دکھائی دینے لگتے ہیں۔ شاعری کب ہے، یہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں، خالد صاحب کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شاعر مخاطب ہوئے،

آپ کو یہ بات جان کر حیرت ہوگی کہ آپ کے والد گرامی جناب اختر حسین جعفری کی کتاب آئینہ خانہ چھپنے سے پہلے ہمارے ہاتھوں میں شکیب صاحب کی کتاب

”روشنی اے روشنی“

ہوتی تھی مگر آئینہ خانہ کے اشاعت کے بعد روشنی اے روشنی ہماری بیڈ سائیڈ پہ چلی گئی اور آئینہ خانہ ہمارے ہاتھوں میں آ گئی۔

جناب اختر حسین جعفری تو ایذرا پاونڈ، ٹی ایس ایلیٹ، پابلو نرودا، بیدل اور حافظ شیرازی کی لیگ کے شاعر ہیں البتہ شکیب صاحب اور جناب جعفری صاحب میں کچھ مماثلتیں پائی جاتی ہیں، جیسے دونوں شعرا کی شاعری میں امیجری پائی جاتی ہے، دونوں شعرا کے کلام میں تصور مرگ پایا جاتا ہے، جعفری صاحب تو زبان اور اظہار اور نظریاتی سطح پر شکیب صاحب سے مختلف شاعر ہیں مگر امیجری اور تصور مرگ مماثلت بہر حال دونوں شعرا میں مشترک ہے۔

جناب خالد سہیل صاحب اس عمر میں یہ نقطہ سمجھ میں آتا ہے کہ خالد احمد صاحب نے مجھے شکیب جلالی کی شاعری کیوں تجویز کی۔

جناب خالد احمد مجھ سے ہمیشہ ایک بات کہتے تھے اگر ممکن ہو تو نیا شعر کہو جیسا شعر شکیب جلالی اور اختر حسین جعفری نے کہا، کہنے کو تو پاکستان میں اتنی شاعری ہو رہی ہے کہ خدا کی پناہ، ایسی شاعری کا کیا فائدہ جب آپ یا تو کلیشیڈ شاعری کرتے رہیں اور روایتی لکیر کو پیٹتے رہیں ستم رسیدہ عشق کی پیداوار شاعری کا رونا روتے رہیں یا اپنی رائگانی کا نوحہ لوگوں کو سناتے رہیں۔ ایسی شاعری کو مشق سخن تو کہا جا سکتا شاعری نہیں۔

جناب خالد سہیل صاحب شکیب جلالی بے مثال شاعر تھا اس کی شاعری کی مدح میں دفتر لکھے جا سکتے ہیں وہ اتنا اور یجنل شاعر تھا کہ کرافٹ، اظہار زبان اور بیان کی قید سے آزاد تھا اور یجنلیٹی اس کا اصل جوہر تھا اس

جو ہر زیریں سطح پر واقعہ تصویری شکل میں موجود تھا جس کا وہ نو برس کی عمر سے چشم دید گواہ تھا اس نے دیکھا کہ اس کے والد اس کی والدہ کو تیز رفتار ریل گاڑی کے سامنے دھکیل رہے ہیں اور یہی واقع اس کی شاعری کی واردات کا فریضہ انجام دیتا رہا جسے ہم شاعر ادیب اور نقاد لوگ اپنے لفظوں میں تصور مرگ کہتے ہیں مگر شکیب جلالی نے تصور مرگ سے خواہش مرگ کا سفر 36 برس کی عمر میں مکمل کیا:

رہی بات اس کی شاعری کی، اس کی شاعری اسی خواہش مرگ اعلان ہے جو وہ عمر بھر کرتا رہا

خیر اندیش

امیر جعفری

خالد سہیل کا جواب

محترمی و معظمی امیر جعفری صاحب!

میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے شکیب جلالی کے بارے میں اپنی ادبی رائے سے نوازا۔ مجھے اس بات کا پوری طرح اندازہ ہے کہ سٹروک کے بعد آپ کے لیے سنجیدہ ادبی تحریریں لکھنا مشکل ہو رہا ہے لیکن پھر بھی آپ نے بڑی ہمت کر کے قسطوں میں اس طویل خط کو مکمل کیا۔ نوازش۔

میں جب شکیب جلالی کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے مصطفیٰ زیدی کا یہ شعر یاد آتا ہے:

اب جی حدود سود و زیاں سے گزر گیا
اچھا وہی رہا جو جوانی میں مر گیا

شکیب جلالی نے جوانی میں خودکشی کر لی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ خودکشی کرنے کے کئی طریقے ہیں

بعض لوگ نشہ آور گولیاں کھا کر جان دے دیتے ہیں

بعض لوگ ورجینیا وولف کی طرح کوٹ کی جیبوں میں پتھر ڈال کر سمندر میں دور تک جا کر ڈوب جاتے ہیں

بعض لوگ بندوق کی گولی سے اپنی جان لے لیتے ہیں

میری نگاہ میں شکیب جلالی نے خودکشی کا جو طریقہ اپنایا وہ بہت ہی جداگانہ اور تشدد آمیز تھا۔

میں سوچا کرتا تھا کہ شکیب جلالی نے ریل گاڑی کے آگے چھلانگ لگا کر کیوں خودکشی کی؟

اس سوال کا نفسیاتی جواب آپ نے دیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ انھوں نے دس برس کی عمر میں دیکھا تھا کہ ان کے والد نے ان کی

والدہ کو ریل گاڑی کے آگے پھینکا تھا۔

آپ نے درست فرمایا کہ تصور مرگ نے دو دہائیوں میں خواہش مرگ کا سفر طے کیا اور شکیب نے اس خواہش پر عمل کر دکھایا۔

دس برس کے بچے پر اس سانحہ کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہونگے کہ وہ اس کا کرب اپنی ذات میں جذب کرتا رہا اور آخر زندگی کے ایک موڑ پر بے قابو ہو گیا۔ اسی لیے ان کا یہ شعر اس تکلیف دہ سانحے کی پیشین گوئی کرتا ہے:

فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

....

میرے لیے اس شعر میں تازہ لہو کے الفاظ اہم ہیں۔

لہو کا لفظ تو ویسے بھی زندگی اور موت کے درمیان ٹوٹے ہوئے پل کا کام کرتا ہے جسے مصطفیٰ زیدی نے بھی اپنے اس شعر میں استعمال کیا:

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

....

کسی اور کے ہاتھوں پہ اپنا لہو تلاش کرنا کسی اور کے ہاتھوں قتل ہونا ایک بات ہے اور اپنے لہو سے اپنے ہاتھ رنگنا دوسری بات۔

امیر جعفری صاحب!

آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ حد سے زیادہ حساس 'غیر روایتی اور باغی ادیب شاعر اور دانشور اپنے روایتی خاندانوں اور سماجوں کی وجہ سے بہت دکھی ہو جاتے ہیں اور بہت سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض دفعہ اقدام خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ مغرب میں اس کی مثالیں سلویا پلاتھ' ورجینیا وولف' ونسنٹ وین گو اور ارنسٹ ہیمنگ وے ہیں اور مشرق میں میر تقی میر' جو جوانی میں ہی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے اور انھیں چاند میں ایک حسینہ کا چہرہ دکھائی دینے لگا جس کا ذکر ان کی مثنوی میں ملتا ہے۔ وہ گھر سے نکلتے تو بچے انہیں پتھر مارتے اس لیے وہ کئی مہینوں تک زندانی و زنجیری ہو گئے اور انہیں ایک کمرے میں ایک زنجیر سے باندھ دیا گیا۔ جون ایلیا بھی نفسیاتی مسائل کا شکار تھے' منیر نیازی اور ساقی فاروقی حد سے زیادہ شراب پیتے تھے اور سارہ شگفتہ نے بھی شکیب جلالی کی طرح ریل گاڑی کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔

قبلہ و کعبہ!

مغربی ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی سوانح عمریاں مل جاتی ہیں اس لیے ان کا نفسیاتی تجزیہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ مجھے شکیب جلالی کی زندگی کے تفصیلی حالات

نہیں ملے اس لیے میں نے ان کی شاعری سے ہی ان کی شخصیت کی آزمائشوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

شکیب جلالی کی دوسروں سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ وہ دکھی رہے پریشان رہے افسردہ رہے۔ دھیرے دھیرے ان کا محبت بھرے رشتوں سے اعتبار و اعتماد اٹھتا گیا اسی لیے رقم طراز ہیں:

ذرا نہ موم ہوا پیار کی حرارت سے
چٹخ کے ٹوٹ گیا دل کا سخت ایسا تھا

شکیب جلالی کو اپنی زندگی میں نجانے کتنے سنگ دل لوگوں سے واسطہ پڑا ہوگا۔

شکیب جلالی کی بچپن سے اذیتیں اور آزمائشیں ان کے دل و دماغ میں جمع ہوتی رہیں۔ انھوں نے شاعری میں اپنے دکھ درد کے اظہار کی کوشش بھی کی اسی لیے لکھتے ہیں:

جو دل کا زہر تھا کاغذ پہ جب بکھیر دیا
پھر اپنے آپ طبیعت مری سنبھلنے لگی

اس طریقے نے کچھ عرصہ تو کام کیا لیکن پھر دل کا زہر بڑھتا گیا وہ دکھی سے دکھی تر ہوتے گئے۔ آزمائشوں کی دھوپ بھی بڑھتی گئی اور غموں کا گرد و غبار بھی بڑھتا گیا لکھتے ہیں:

کچھ ہو گیا ہے دھوپ سے خاکستری بدن
کچھ جم گیا ہے راہ کا گرد و غبار بھی

....

ہر سچے شاعر کی طرح شکیب جلالی بھی سچ بولنا چاہتے تھے حق بات کرنا چاہتے تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ جس منافق معاشرے کے باسی ہیں وہیں سچ بولنے اور لکھنے والوں کو

زہر پلا دیا جاتا ہے
سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے
پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے
زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا جاتا ہے
یا شہر بدر کر دیا جاتا ہے

فرماتے ہیں

حق بات آ کے رک سی گئی تھی کبھی شکیب
چھالے پڑے ہوئے ہیں ابھی تک زبان پر

....

جب انسان اپنے سچ کا برملا اظہار نہ کر پائے تو اس کے رشتوں میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں احباب دور ہونے لگتے ہیں اور تعلقات میں بدگمانیاں بڑھنے لگتی ہیں ان حالات میں کسی کا حال پوچھنا بھی محال ہو جاتا ہے اور دل رنجیدہ ہو جاتا ہے

اب انہیں پرسش حالات گراں گزرے گی
بدگمانی ہو تو ہر بات گراں گزرے گی

....

ان حالات میں رشتوں میں تناؤ بڑھنے لگتا ہے تعلقات ٹوٹنے لگتے ہیں مرنے لگتے ہیں اور

انسان زندہ ہوتے بھی بار بار مرنے لگتا ہے:
اس مرحلے کو موت ہی کہتے ہیں دوستو
اک پل میں ٹوٹ جائیں جہاں عمر بھر کے ساتھ
قبلہ و کعبہ!
ایک شاعر ہونے کے ناطے آپ جانتے ہیں کہ ہر شاعر کی شاعری میں کچھ مخصوص استعارے ہوتے ہیں جو اس کے ماسٹر سمبلز ہوتے ہیں یہ استعارے ہمیں اس شاعر کی نفسیات سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔
شکیب جلالی کی شاعری کے ماسٹر سمبلز میں سے ایک چاند ہے جسے وہ کئی حوالوں سے پیش کرتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں دو اشعار ملاحظہ ہوں:
کیا جانیے کہ اتنی اداسی تھی رات کیوں
مہتاب اپنی قبر کا پتھر لگا مجھے

میں نے اسے شریک سفر کر لیا شکیب
اپنی طرح سے چاند جو بے گھر لگا مجھے

چاند جو روایتی اردو شاعری کا رومانوی استعارہ ہے شکیب جلالی کی شاعری میں اداسی کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے۔
شکیب جلالی جہاں جاتے تھے ان کی حق گوئی کی وجہ سے مسائل انہیں گھیر لیتے تھے دشواریاں بڑھ جاتی تھیں آزمائشیں گلے ملنے آ جاتی تھیں اسی لیے فرماتے ہیں:
مجھ کو آمادۂ سفر نہ کرو
راستے پر خطر نہ ہو جائیں
شکیب جلالی کے دکھ درد ان کی تکلیفیں اور آزمائشیں اتنی بڑھ گئیں کہ انھوں نے جوانی میں ہی موت کو بڑھ کر گلے لگا لیا۔
شکیب جلالی کی وفات کو مدت ہو گئی لیکن ان کی زندگی ان کی شاعری اور ان کی خودکشی آج بھی ایک معمہ ہے ایک بجھارت ہے ایک پہیلی ہے ایک راز ہے۔ اسی راز کے بارے میں وہ لکھ گئے ہیں:
ہر آن میرا نیا رنگ ہے نیا چہرہ
وہ بھید ہوں جو کسی سے نہ میری جان کھلا
امیر جعفری صاحب
شکیب جلالی بھی سعادت حسن منٹو، مصطفیٰ زیدی اور اوسکر وائلڈ کی طرح جوانی میں ہی رخصت ہو گئے اور ادبی دنیا کو سونا اور اداس کر گئے۔ یہ خط لکھتے ہوئے میں بھی اداس محسوس کر رہا ہوں اس لیے اس خط کو یہیں ختم کرتا ہوں۔
اگر آپ کو کہیں شکیب جلالی کی تفصیلی سوانح عمری ملے تو مجھے ضرور بتایئے گا میں اسے ضرور پڑھنا اور کچھ اور لکھنا چاہوں گا۔
آپ کا ادبی دوست
خالد سہیل

☆☆☆☆☆

رُوپہلے گھونسلے کا خواب اور برہنگی

[صابر ظفر کے 56 ویں شعری مجموعے، پنچھیوں کی دُعا ہے جنگل، کے تناظر میں]

پنچھیوں کی دعا ہے جنگل، کی شاعری شجر سے گفتگو اور پتّوں سے کلام ہے۔ اک جنگل ہے پرانے مکین ہیں فطرت کی راہیں ہیں ناصر کاظمی کے شعری ڈرامے، سر کی چھایا، کی سی فضا ہے وہاں کی پر اسراریت، ڈر، بیچ جنگل سے ریل گاڑی کا گزرنا جنگل میں آگ کا لگ جانا اور دوسری جگہ جگہ گھیرتی حیرتیں پر یہاں صابر ظفر کا اپنا لحن ہے:

پتّوں سے کلام کر رہا ہوں
جیسے مجھے سن رہا شجر ہے

میں اُس کے قریب جا رہا ہوں
شاید مجھے دیکھتا شجر ہے

دیتا ہے پناہ پنچھیوں کو
اس واسطے وہ بھلا شجر ہے

نیندیں ہیں ہیشگی کی نیندیں
اور نیندوں میں خواب کا شجر ہے

خاموش ہیں گرچہ ساری طرفیں
جنگل کا بیانیہ شجر ہے

....

یہ کتاب ہے ہی درختوں کی ورائی شاعری۔ درختوں کی نفسیات سے اتنا واقف شاید کوئی اور ہو۔ منیر نیازی، ناصر کاظمی اور شکیب جلالی کے ہوتے ہوئے صابر ظفر کی شجر کاری کی خوشبو من کو بھانے لگے تو سمجھو کہ چھپن نمبر مجموعہ خاصی انرجی کا حامل ہے:

لگا رہے کوئی ہر آن جھمگھٹا گویا
جو پنچھی بیٹھے ہیں، بیٹھے رہیں درختوں پر

انہی کے دم سے ہو گہوارہ امن کا یہ چمن
وہ فاختائیں جو رہنے لگیں درختوں پر

جو رات گہری ہے وہ اور گہری لگ رہی ہے
اگرچہ چاند کی کرنیں پڑیں درختوں پر

خوشی کے ساتھ کئی بار اداس کرتی ہیں
برسنے والی کئی بارشیں درختوں پر

تنویر قاضی

درختوں اور گھونسلوں کی کومٹمنٹ اور وصل و جدائی کے کچھ اور رنگ دل کرتا ہے آپ بھی محسوس کریں:

کھلا یہ رنگ تمنا جھکے درختوں سے
درخت وصل طلب دوسرے درختوں سے

بہار آئے گی اور کوئی لوٹ آئے گا
دل امید کے دھاگے بندھے درختوں سے

خزاں کا زہر الگ تھا مگر نہ سوچا تھا
کہ چھاؤں چھینے گا کوئی گھنے درختوں سے

ہماری بات تو کم کم ہی ان سے ہوتی ہے
ہوا ، کلام مسلسل کرے درختوں سے

قرار پاتی ہے گویا سکونت ہستی
بندھے ہوئے ہیں کئی گھونسلے درختوں سے

....

مجموعے میں جنگل اور وہاں کے سبھی بیل بوٹے اور درخت موجود ہیں اور ساتھ میں مختلف کیفیات میں ان کی بُو باس سے متعلق نو ہاؤ ملتی ہے ان اشجار کی لکڑی لکڑی مہک بھیتر دہکنے لگتی ہے۔ بکائن، شیشم، انگور کی بیلیں، سرکنڈے، کیکر، خاروخس، سفیدہ غزلیہ روپ میں آچکے ہیں:

بدن اگرچہ بکائن سا بردبار دیا
مگر پناہ جو دی ، آہنی حصار دیا

میں دھوپ میں تھا تو شیشم کی اس نے چھاؤں دی
یہ قرب خاص مجھے صورت بہار دیا

....

پھر وہ کہتا ہے:

اک شجر کے ہو بعد ایک شجر
اک سفیدے کی چھاؤں کم ہے مجھے

....

پچھلے دنوں ایک عالمی سطح کی شخصیت کو خبط رہا جنگل اگانے کا کہ جنگلات کا پھیلاؤ ہی حیات ہے سیارے کی گرمائش کے آگے مزاحمتی وسیلہ ہے۔۔ اس کے اس جنوں کا مذاق اڑایا گیا آج گلوبل وارمنگ درخت درخت کی صدائیں دیتی ہے جس میں پنچھی پیش پیش ہیں:

درخت اور برہنگی اس شعری مجموعے کا موضوع، مسئلہ اور مرکز ٹھہرتے ہیں یہاں انسان اور شجر کی تخصیص نہیں رہی دونوں ایک سانچے میں ڈھلے برہنگی کا دکھ بھوگتے ہیں۔۔ دونوں ایک ہی طرح سانس لیتے اور مرتے دکھتے ہیں۔

دکھ ہے اپنی برہنگی کا
ہر خزاں سے خفا ہے جنگل

جب سے بے برگ ہو گیا ہے
ہم نوا ہو گیا ہے جنگل

کچھ زمیں ہے ابھی برہنہ
کچھ زمیں کی قبا ہے جنگل

پت جھڑ اس میں پناہ ڈھونڈیں
ویسے اب تک گھنا ہے جنگل

پیڑ کٹتے چلے گئے ہیں
ٹکڑیوں میں بٹا ہے جنگل

پتا پتا بکھر کے چپ ہے
صبر کی انتہا ہے جنگل

یہاں ٹھہرے ہوئے موسم کی چھتری تنی رہتی ہے اور سبھی اس ایک چھتری میں آنا چاہتے ہیں اور مطمئن ہیں ایک تو یہ ناہنجار بیگانگی کا لحاف نہیں اترنے کا نام لیتا بھیتر کی مونگ پھلیاں کھانے والے مانسوں کی جھوں بہت ڈاھڈی ہے--

موسم آئے تو جاگے شاید
یہ جو سویا ہوا ہے جنگل

چھاؤں چھینی گئی ہے ساری
ایسے کاٹا گیا ہے جنگل

جو اکیلا جئے وہ جانے
رنج کیا کھینچتا ہے جنگل

مانع زباں درازء تحمل نمو تو ہے
قانون خامشی کے یہ روبکار دیکھ

آئینے میں ہے پیڑ کی تصویر
اور ہے دور آئینہ ہم سے

تقدیر کسی کی دم بخود تھی
تعویذ درخت سے بندھا تھا

تعظیم بہار کے سبب سے
وہ سیدھا درخت خم رہا تھا

ایک طویل غزل جس کی ردیف جنگل ہے جہاں جنگل، مانس اور مانس جنگل ہے یعنی ایک دوسرے کا عکس ہیں جیسے باری باری سیلفیاں لے رہے ہوں مذکورہ پرتو۔ سائے پرچھائیں آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں--

خوف رہتا ہے اس کے بھیتر
بات یہ مانتا ہے جنگل

رنگ وہ دیکھتا رہا ہوں
جو بدلتا رہا ہے جنگل

دونوں جا جا کے دیکھ لیجے
شہر کیا اور کیا ہے جنگل

کیسے کوئی بچھڑ گیا ہے
کیسے مرجھا گیا ہے جنگل

تنہائی جنگل بھی بھوگتا ہے سو کبھی شہروں سا لگنے لگتا ہے۔
شہروں اور جنگلوں دونوں پر تنہائی ایک سی اترتی ہے صابر ظفر کی یہ شاعری ہمیں اس ورژن کے اور قریب لے آئی پنچھیوں،

پھولوں، پتوں، ہواؤں کے اظہار نے یہ
تنہائی عریاں کر کے رکھ دی ہے۔۔

ہوتے نہیں سکوت سے اشجار خوش کبھی
پنچھی پکارتے ہیں سر شاخسار دیکھ

رشتے تمام، پھولوں کے رشتے نہیں یہاں
جنگل سے منسلک بھی ہے اک خارزار دیکھ

جو دیکھتا ہے تجھ کو، گریزاں نہ اس سے ہو
جو جانتا ہے تجھ کو، وہی رازدار دیکھ

....

پنچھیوں کی دعا کی برکت سے دلوں کے بھید بھی ہرے ہوئے بھیڑیوں سے ڈرے ہوئے مانس چراگاہوں کی طرف جانے لگے یہ گم شدہ چراگاہیں انسانوں کے قدموں سے مہکنے لگیں، اون اون دہکنے لگیں۔۔

اتنی بہتات میں پتے، ٹہنیاں، چھال پر جنگل کی برہنگی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی شجر شجر بن پوشاک ہونا نیچر کو ایک چیلنج ہے سو سیلاب کا تیور انتقام سے لبریز گلی گلی اژدل سانڈ بنا چلا آتا ہے تبھی پانی عافیت و سیرابی کی بجائے آفت بنا ہوا ہے بستیوں، کھیتیوں، پلوں کو روندتا چلا جاتا ہے۔۔

مسنگ پرسنز اور نباتات کی کہانی ایک سی لگتی ہے جنگل کہیں اور سے لا کر رکھا گیا ہے اور مسنگ پرسنز تو ہیں ہی اوپرے۔

گم ہے یوں جس طرح کہیں سے
لا کے رکھا گیا ہے جنگل

جو نہیں آیا پنچھی آئے
مائل التجا ہے جنگل

اک بھی پتا نظر نہ آئے
کس ٹھکانے لگا یہ جنگل

سرسرائے کہاں ہیں پتے
اشتباہ صدا ہے جنگل

جب بھی روپوش ہونا چاہا
سب سے اچھا لگا ہے جنگل

....

اشجار سے وفا جڑی ہوئی ہے یعنی زندگی سے ایک کومٹمنٹ سی آکسیجن جیسی با اعتبار جسے انسانی بے وفائی کی دیمک چاٹتی اپنی ساکھ کھو بیٹھتی ہے نیچر درخت، جنگل، ہوا اور موسموں کی عاجزی میں قابل دید ہے۔

رہ کے دیکھا ہے بہت دن صحبت اشجار میں
سایہ سایہ ہیں وفائیں قامت اشجار میں

ہم ترے دل میں تھے خوش، جیسے پرندے شاخ پر
منزل ہستی تھی گویا رفعت اشجار میں

سارے پتے سارے بوٹے اس طرح یکجان تھے
سارا باغیچہ تھا شامل حرمت اشجار میں

ہر تکبر سے مبرا عاجزی ہے شاخ شاخ
وصف چھاؤں دینے کا ہے فطرت اشجار میں

ہر کسی کے واسطے یکساں ہیں یہ سایہ فگن
سرفرازی ہے وفا کی، قامت اشجار میں

....

فطرت کی کتھا بہت مختلف، منفرد طریق پر اس غزلوں کی غزل میں کہی گئی ہے جہاں، موجودات، جمادات، نباتات، مانس، چرند، پرند، جل حیات کی شکل میں اکٹھے ہو گئے، اکائی سی بن گئی ہنت در ہنت ایک سیون بھی ادھر ادھر ہوئی نہیں در وبست بکھرا نہیں۔ اس غزلوں کی غزل کا ہر مصرعہ مجھے بھایا اس کی بوقلمونی نے دل کے تار ہلائے کچھ اشعار آپ بھی دیکھئے گا:

کاش جنگل میں راستا جاتا
میں بھی پانی کے شور سا جاتا

جسم کے پتے، روح کے پتے
سبز ہونا انہیں سکھا جاتا

کسمساتا جو پیڑ بیری کا
کوئی پتھر ہی پھینکتا جاتا

یہ جو پتوں کے ڈھیر سی ہے حیات
کوئی اس کو بکھیرتا جاتا

جان تو چھوٹتی درندوں سے
کاش جنگل کوئی جلا جاتا

جاگ جاتا نصیب لکڑی کا
بانسری جو کوئی بجا جاتا

اتنے اونچے تھے ناریل کے درخت
دھیان ادھر دیر سے ذرا جاتا

....

شاعر رومینس سے کبھی نہیں چوکتا ایسا ہونا بھی چاہیے لیکن یہ ایک ہی شعر اتنا پر لطف نقش لئے ہوئے ہے جو بے مثل ہے ایسا خیال کبھی اترتا ہے۔

گواہی دینا جامن کے درختو
کسی کا ہونٹ کیوں نیلا رہا ہے

....

سجاد خالد کا بنایا کیلی گرافک ٹائٹل ہمیشہ کی طرح یونیک لگا جو زیادہ پھول بوٹوں سے بچا لیا گیا کہ کتاب "پنچھیوں کی دعا ہے جنگل" رنگوں میں گم ہونے کے لئے کافی تھی۔

اس سیارے کے گلوبل ولیج میں زیادہ تر خطے میں نظم کی حکمرانی ہے پر ہمارے غزل گو میر، غالب، فیض، منیر، ناصر، شکیب کی جلو میں، احمد مشتاق، خورشید رضوی، سرمد صہبائی، انور شعور، صابر ظفر، افضال احمد سید، ریاض مجید، محمد اظہار الحق، نذیر قیصر، فیصل عجمی، خمار امیر زادہ شاہد ماکلی، عابد رضا، ضمیر قیس، غزل کے عشق میں شدید مبتلا نظر آتے اپنے کام میں براجمان ہیں۔۔ غزل بوقلمونی کی امیری صابر ظفر کے سنگ ہی چلتی ہے سو وہ ہی اس سیناریو کے امیر ٹھہرتے ہیں۔

محمد سلیم الرحمٰن کی نظموں میں پتے کو بلیغ استعارہ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے انہوں نے مختلف زاویوں سے پتے کو دکھایا حتیٰ کہ پتے کی رگیں

تک دکھائی پڑنے لگیں ابھی اس استعارے کی تہہ تک پہنچ رہا تھا کہ صابر ظفر کے ہاں پتے جو اگلی پرت میں انسان ہی کا روپ ہیں بڑے در کھول رہے تھے ہواؤں کو صدائیں دیتے کواڑ کھٹکھاتے۔۔ آیئے دیکھیے:

پتے ، پتوں کو چھونا چاہیں
خواہشوں سے بھرا ہے جنگل

پتا پتا بکھر کے چپ ہے
صبر کی انتہا ہے جنگل

پتے بے اختیار چہرے
کھلکھلا کے ہنسا ہے جنگل

یہ پتے تاش کے پتے نہیں ہیں
یہاں تو ہر کوئی مرجھا رہا ہے

جسم کے پتے ، روح کے پتے
سبز ہونا انہیں سکھا جاتا

یہ جو پتوں کے ڈھیر سی ہے حیات
کوئی اس کو بکھیرتا جاتا

دیکھ پاتا جو سوکھے پتوں کو
میں خزاں کا سراغ پا جاتا

پتوں سے کلام کر رہا ہوں
جیسے مجھے سن رہا شجر ہے

سوکھے پتوں نے ہم کو یاد رکھا
موسم ہجر کا خلاصہ تھے

تیرتے تھے خوشی سے سب پتے
ہم وہ جنگل میں بہتا چشمہ تھے

جس نے دیکھے تھے پتے گرتے ہوئے
ہم ہی وہ بے قرار لمحہ تھے

پتے بکھرتے دیکھ کے، ہر طائر حیات
ایسے خموش ہو گا، تو ا بھول جائے گا

پتے گرنے کی تھی صدا کوئی
جو مخاطب رہی سدا ہم سے

پتوں کی کتھا بہت عجب تھی
اک پیڑ بغور سن رہا ھا

جب پتے بکھرتے جا رہے تھے
کیا کوئی درخت رو رہا تھا

....

اوپر جس یونیک پرسٹیلٹی کا ذکر کیا وہ دھرتی کو پھول بوٹوں سے بھرا دیکھنا چاہتا تھا اس نے اربوں پودے لگائے بھی وہ جسے نئے آنے والے ملک کے بچے کی نیٹریشن کی فکر تھی جو ایک جیسا تعلیمی نصاب چاہتا تھا سیاسی، معاشی، سماجی، اور شخصی لحاظ سے اس سیارے پر رہنا اس کا خواب تھا کسی پہنائی سے آس کی آواز آتی

ہے، قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو، کہیں تو بحر خدا آج ذکر یار چلے، قیدی کی آواز سوا نمایاں ہوتی جارہی ہے۔ صابر ظفر بھی اس جیسا فطرت کا پجاری ہے کہ یہی یونیک طاقت ہے۔

ٹمبر مافیا کے ہاتھوں میں چیختا جنگل کبھی آپ نے دیکھا ہے؟ نہیں۔۔ تو دیکھیے ہماری دھرتی کا اصل چہرہ ان بدمعاشوں کی بغل میں ہے اسی لیے چوری اور اس بدمعاشیہ کا ساتھ چولی اور دامن کا ہے۔

لکڑی چوروں کا جرم جگہ جگہ نوشتہ ہے۔

چاہیے چوب خشک کس کو
کون یہ چیرتا ہے جنگل

کون دشمن ہے زندگی کا
کس کے ہاتھوں کٹا ہے جنگل

پیڑ اجاڑے گئے ہیں یعنی
زخم جیسے ہرا ہے جنگل

اب تو خنزیر آ گئے ہیں
پہلے خالی رہا ہے جنگل

کس نے بیچا ہے یہ ذخیرہ
ہاتھ کس کے لگا ہے جنگل

....

بے چہرگی کے نمونے جو ہماری حیات سے جڑے ہیں وہ بھی دہائی دیتے ہیں۔

شام ہوتے ہی یہ کھلا ہے
دھوپ کا حاشیہ ہے جنگل

دور تک زرد سے ہیں چہرے
دور تک زرد سا ہے جنگل

سپنے پتوں کی طرح بکھریں
جیسے یہ نیند کا ہے جنگل

کاٹنے کو نہ کیسے دوڑے
کتنا سونا پڑا ہے جنگل

بچے خوابوں کے اڑ رہے ہیں
نیند سے رونما ہے جنگل

....

ساری آلودگی، بے چہرگی اور دھبہ دھبہ ملکیت کے ہوتے ہوئے شاعر امید باندھتا، نشاندہی کرتا، سانجھے پیارے اور تخیل تخن چوبارے کا خواہاں ہے۔۔

کمال کی شاعری ہے انرجی سے بھری دلوں کی بارودی سرنگوں کو صاف کرتی

صابر ظفر تو ایسے اعلان کرتا ہے جیسے بیڑیاں کھل گئی ہیں اور قیدیوں کو ادراک نہیں یا پھر بیگانگی سے باہر آنے کا اشارہ اس کے ذہنی حاشیے میں کہیں پڑا ہے۔۔

باڑھ کوئی نہیں لگائی
ہر طرف سے کھلا ہے جنگل

پھیلے تخیل سخن بھی شاید
جس طرح پھیلا ہے جنگل

☆☆☆☆☆

گلناز کوثر ایک میٹاماڈرن شاعرہ

اکیسویں صدی کی اردو نظم اپنے عہد کی جذباتی ساخت (structure of feeling) میں ایک نئے شعوری اور جمالیاتی موڑ پر کھڑی ہے، جہاں احساس اور عقل، یقین اور تذبذب، روحانیت اور سائنسی شعور ہی نہیں بل کہ امید اور مایوسی، ایمان اور طنز، روایت اور امکان، اور خودی اور لاشعور کے درمیان ایک مسلسل تذبذبی ارتعاش (oscillation) جاری ہے — جو اس عہد کے انسان کی تخلیقی توانائی کا سرچشمہ ہے۔

یہ وہ عہد ہے جس کی اساس informed naivety یعنی باخبر سادہ لوحی اور ironic sincerity یعنی طنزیہ اخلاص پر قائم ہے؛ ایک ایسا فکری و تخلیقی فضا نامہ جس میں انسان بیک وقت ایمان اور شک، معنی اور خلا، جدید امید اور مابعد جدید مایوسی کے بیچ جھولتا ہوا معنی تخلیق کرتا ہے۔

یہ عہد، جو نہ محض جدید ہے نہ مابعد جدید، دراصل ایک "both/and logic" کا عہد ہے — جہاں تضاد مخالفت نہیں رہتا بل کہ تخلیقی توانائی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہاں شاعر مابعد جدیدی بکھراؤ postmodern fragmentation کے ملبے پر کھڑا ہو کر reconstruction اور

علی ارمان

re-enchantment کی جستجو کرتا ہے—
یعنی وہ بکھرے ہوئے معنی کو نئی وحدت میں بدلنے کی کوشش کرتا ہے
یہی باخبر جھول (meta-awareness) اس عہد کو ایک منفرد میٹا ماڈرن شعری کائنات بناتا ہے، جہاں فن، فکر، اور احساس ایک دوسرے کی نفی نہیں بلکہ تکمیل ہیں۔
یہی وہ تخلیقی مرحلہ ہے جس میں شاعر post-ironic sincerity کے ساتھ معنی کی تلاش میں مصروف ہے— وہ سچائی پر یقین رکھتے ہوئے بھی اس کے خدوخال پر سوال اٹھاتا ہے، اور اسی سوال میں اپنی تخلیقی نجات تلاش کرتا ہے۔
یہی وہ مقام ہے جہاں میٹا ماڈرن ازم اپنی فکری شناخت کو مابعد جدیدیت سے الگ کر لیتا ہے۔ مابعد جدید عہد نے جہاں ہر سچائی کو شک کی نظر سے دیکھا، وہاں میٹا ماڈرن عہد اسی شک کی راکھ سے ایک نئی امید کی کونپل اگاتا ہے۔ یہ عہد سچائی کے خاتمے کا نہیں بلکہ اس کی ازسرِنو تخلیق کا عہد ہے — ایک ایسا شعوری مرحلہ جہاں انسان طنز (Irony) کے پس منظر میں بھی اخلاص (Sincerity) کی جستجو کرتا ہے
مابعد جدیدیت نے معنی کو منہدم کیا تھا، جب کہ میٹا ماڈرن ازم انہی بکھرے ہوئے معنوں کو oscillation یعنی تضادات کے بیچ جھولتے ہوئے ازسرِنو تعمیر کرتا ہے۔
گویا یہاں طنز اور اخلاص، یقین اور تذبذب، خواب اور حقیقت ایک دوسرے کو رد نہیں کرتے بل کہ اسی باہمی کشمکش میں ایک نیا معنوی توازن پیدا کرتے ہیں— اور یہی توازن اس عہد کے فنکار کا بنیادی جوہر ہے۔ اکیسویں صدی کا یہ منظرنامہ دراصل ویسا ہی تاریخی موڑ ہے جیسا بیسویں صدی کے ۱۹۵۲ میں نمودار ہوا تھا— ایک ایسا وقت جب انسانی شعور اپنی نئی تشکیل کی طرف بڑھ رہا تھا ظاہر ہے یہ تبدیلیاں اپنی ماہیت و نوعیت میں بیسویں صدی کی اُن تبدیلیوں سے مختلف ہیں، مگر ویسی ہی ''پیراڈائم شفٹ'' کے امکانات اور اثرات لیے ہوئے ہیں جیسا گزشتہ صدی کے اس عرصے میں ہوا تھا۔
یہ منظرنامہ محض تکنیکی ارتقا کا نہیں بل کہ ایک نئے شعوری اور تخلیقی عہد کا اعلان ہے، جہاں علم و احساس، سائنس و وجدان، روایت و امکان اور متن و قاری کے مابین نئے رشتے

جنم لے رہے ہیں۔ اس تناظر میں شاعر کا منصب بھی بدل گیا ہے ۔ اب وہ محض وجدانی اظہار کا امین نہیں رہا بلکہ ایک ایسی معنوی کائنات کا معمار ہے جو ظاہر و باطن، عقل و احساس، یقین و تذبذب، سب کے درمیان ایک نیا توازن قائم کرتی ہے۔

یہی وہ تخلیقی و فکری پس منظر ہے جس میں اکیسویں صدی کی اردو نظم اپنے نئے مزاج اور شعوری ساخت کے ساتھ ابھر رہی ہے۔

اس منظرنامے میں جب ہم معاصر اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو گزشتہ چند برسوں میں ابھرنے والی معدودے چند آوازیں نمایاں طور پر اسی میٹا ماڈرن شعور کی نمائندگی کرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔

ان میں سے ایک روشن مثال گلناز کوثر کی ہے، جس کی شاعری اس نئے عہد کے تمام فکری اور جمالیاتی تناؤ ـــــ عقل و احساس، یقین و تذبذب، روحانیت و سائنسی شعور، اور داخلی و خارجی تجربے ـــــ کے بیچ جھولتے ہوئے معنی تخلیق کرتی ہے۔ ان کے یہاں نہ postmodernist انکار کی سرد مہری ہے، نہ modernist یقین کی قطعیت، بل کہ ایک باخبر اخلاص اور وجودی oscillation ہے جو انھیں اپنی نسل کی ایک منفرد اور فکری طور پر بیدار شاعرہ بناتا ہے۔

گلناز کوثر کی شاعری اسی عہدِ تغیر کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ ان کے مجموعے مایا کی نظمیں اس شعری انقلاب کا حصہ ہیں، جس میں بیسویں صدی کے بڑے فکری ازموں کا طرزِ احساس و اظہار ـــــ یعنی جدیدیت کی خود آگاہی، ترقی پسندی کی انسان دوستی، علامت نگاری کی تہ داری، اور روحانیت کی اشراقی جہت ـــــ اکیسویں صدی کی حیاتی ساختوں سے ابھرتے ہوئے نئے طرزِ احساس و اظہار اور نئے شعری شعور سے ہم آمیز ہوتا ہوا ایک نیا میٹا ماڈرن شعری منظرنامہ تخلیق کرتا ہے۔

گلناز کوثر کی نظمیں سنتے اور پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا اور "کاتا اور لے دوڑی" والے کاروانِ کوتاہ زبان کا حصہ نہیں بنیں۔ انھوں نے صنفِ نظم کا اسلوبیاتی ریاض اور معنویاتی تگ و تاز قابلِ رشک حد تک آشفتہ خوئی اور یکسوئی سے مکمل کر کے شاعری میں اپنی آواز کو تلاشا اور تراشا ہے۔

ان کی نظموں کی خاص بات اس میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کی بیسویں صدی کی اعلیٰ نظمیہ شعری روایت کے نایاب و نادر امتزاج کا

وافر حد تک پایا جاتا ہے، اور ان کی نظموں میں خواص وعوام ہر دو طبقوں کے لیے لطف ولگاؤ کے لوازمات خاصی حد تک موجود ہیں۔

یوں گلناز کوثر کا شعری تجربہ اردو نظم کے سفر میں ایک ایسے موڑ کی نشاندہی کرتا ہے جہاں فکر واحساس، نسائیت وانسانیت، اور جدیدیت وروحانیت باہم ہم آہنگ ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ان کی شاعری اس امر کی علامت ہے کہ اردو میں بھی ایسے شعرا موجود ہیں جن کی تخلیق اکیسویں صدی کی عصری انسانی کیفیت سے فنی، فکری اور شعری سطح پر جڑی ہوئی ہے۔ وہی کیفیت جسے میں ٹیموتھیس ورمولن اور رابن فاندے آکر سے استفادہ واتفاق کرتے ہوئے میٹا ماڈرن ازم کے نام سے شناخت کرتا ہوں: ایک ایسا عالمی فکری مزاج جو نئے پُرخلوص یقین اور مابعد جدیدی مشکوک بے یقینی کے درمیان مسلسل ارتعاش (oscillation) میں معنی کی نئی تشکیل کرتا ہے۔

یہ رجحان نہ تو جدیدیت کی سادہ آرزومندی ہے، نہ مابعد جدیدیت کی بے یقینی میں پناہ، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک شعوری جھول (meta-awareness) ہے جس میں طنز اور اخلاص، امید اور مایوسی، حقیقت اور فریب، سب بیک وقت موجود رہتے ہیں۔

میٹا ماڈرن رویہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ شاید کوئی حتمی سچائی ممکن نہ ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس کی تلاش سے دستبردار نہیں ہوتا۔ یہ وہ عہدِ شعور ہے جو میٹا نیریٹو کے انہدام کے بعد بھی ایک نئے بیانیے کی جستجو کو معنویت کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ گویا یقین کے امکان پر سوال اٹھاتے ہوئے بھی، یقین کی طلب کو زندہ رکھنا ہی اس کا سب سے بڑا اخلاقی و جمالیاتی وصف ہے۔

گلناز کوثر کی نظموں میں یہی میٹا ماڈرن رویہ شعوری یا لاشعوری سطح پر جلوہ گر ہے۔

وہ مابعد جدیدی انتشار (Postmodern Fragmentation) کے بعد معنی کے بکھرے ذرات کو یکجا کر کے ایک نیا نظامِ احساس تشکیل دیتی ہیں۔ ایسا نظام جو یقین اور تذبذب دونوں کو بیک وقت برتنے کی سعی کرتا ہے، اور معنی کے خاتمے کے ماتم کی بجائے اس کی ازسرِنو تخلیق پر ایک متشکک یقین رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆

لچک اور سرخ گلاب: افسانے

غلام عباس کے افسانوی اسلوبِ بیان اور دو افسانے ''لچک'' اور ''سرخ گلاب'' پر تفصیلی تبصرہ

غلام عباس اردو ادب کے ایک منفرد افسانہ نگار ہیں انھوں نے زیادہ تر سماجی معاملات کو اپنا موضوع بنایا۔ وہ بہت کم عمری سے افسانہ لکھ رہے تھے لیکن شروع سے ہی ان کے افسانے کا موضوع کبھی محبت یا عورت نہیں رہی تھی۔ بلکہ وہ ہمیشہ معاشرے کے مجموعی تاثر کو ہی اپنے افسانے کا موضوع بناتے۔ ان کے موضوعات میں بلاشبہ تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر افسانے طرزِ زندگی، فرقہ پرستی اور انسان کی نفسیات پر ہی مبنی ہیں۔ وہ ایک موضوع کو لے کر چلتے ہیں اور پھر اسے پرت در پرت کھولتے چلے جاتے ہیں، تمام مضمرات پر بات کرتے ہیں لیکن کہاں اختتام کر دیں اور قاری کے سوچنے کے لیے راستہ ہموار کر دیں کچھ پتا نہیں چلتا۔

مذکورہ افسانہ ''لچک'' مذہبی فرقہ واریت پر مشتمل ہے۔ ایک حساس لکھنے والا اپنے اندر کئی معاملات پر الجھتا رہتا ہے اور کبھی کبھار تو وہ اپنے تئیں ان مسائل کے حل بھی تلاش کر لیتا ہے وہ سمجھتا ہے اگر اس طرح کیا جائے تو معاملات میں بہت زیادہ بگاڑ نہیں آئے گا یہی وجہ ہے کہ وہ اس موضوع کو اپنے طور پر لکھ کر پڑھنے والوں کو اس مسئلے کا اپنی طرف سے حل دے دیتا ہے۔

اس افسانہ میں بھی غلام عباس نے یہی کہا ہے کہ ہم اپنے بنیادی رویوں میں لچک لا کر مسائل کی شدت کم کر سکتے ہیں۔ وہی مسائل جو قتل و غارت گری کی وجہ ہوتے ہیں ذرا سی لچک سے آسانی سے سلجھ بھی سکتے ہیں۔ اس بات کا سارا دارومدار انسان پر ہے۔

افسانہ ''لچک'' ایک متوازن سوچ کے حامل بندے کی تقریر پر مبنی افسانہ ہے۔ آخر تک تقریر کا تسلسل ہی رہا ہے۔ کوئی موڑ یا تبدیلی نہیں آئی۔ اس طرح کے تجربات اکثر اوقات ہمیں غلام عباس کے ہاں ہی ملتے ہیں۔ ایک ہی صورتحال کو افسانہ بنانے کا فن اور مہارت اس مصنف کی خوبی ہے۔

ثمینہ سید

اس افسانے میں وہ کہتے ہیں کہ مسائل کو بہت بڑا اور بڑھاوا دے کر دیکھا جائے تو بہت سے فرق نکل آتے ہیں، تضادات تنگ کرتے ہیں لیکن اگر متوازن نقطہ نظر اپنا لیں تو کوئی مسئلہ بڑا نہیں لگتا۔ لکھتے ہیں کہ

''جب اس حیّ قیوم اور کائنات کے مالک نے کائنات کو تخلیق کیا تو اپنے ایک فرشتے 'برہما' کے وسیلے سے نوعِ بشری کی ہدایت کے لیے ایک کتاب ''مسمی بہ وید'' نازل کی۔ اس کے چار دفتر ہیں۔ اور امر و نہی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے واقعات ہیں۔''

غلام عباس اپنے اس افسانے میں ہندو مذہب کو اہلِ کتاب کہہ کر معاملے کی شدت کو ہی کم کرنا چاہتے ہیں وہ لڑائی ختم کرنے کے متمنی ہیں وہ ہندو اور مسلم مذہب میں ڈھیروں مماثلت تلاش کرتے چلے جاتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ صدیوں سے ساتھ رہنا بھی دلوں اور نسلی سلسلوں کو کہیں نہ کہیں جوڑتا ہے جو بھی نفاق ہے وہ ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ مصنف اصل میں امن کا علمبردار ہوتا ہے۔ وہ جنگ کی نفی کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ اس کے نزدیک کافی مضبوط ہے جس کے لیے غلام عباس انسانی رویوں میں لچک کے قائل ہیں۔ اس افسانے میں انھوں نے نرم روی اور انسانیت کی انتہا کردی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

'برادرانِ اسلام ہندوستان کی حیثیت اس وقت ایک سیکولر کی ہے یعنی لادینی لادینی مملکت کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں نہ تو اسلام کی کوئی اہمیت ہے نہ ہندو دھرم کی اور نہ ہی سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں کے مذہب کی اور میں سمجھتا ہوں۔ یہی وہ سیدھا اور سچا راستہ ہے جس پر چل کر ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے۔''

مصنف کی اصل خواہش امن ہے۔ وہ کچھ چھوٹے موٹے تفرقات کو نظرانداز کر کے وسیع القلبی کی ضرورت پر زور دے رہا ہے کہ یہی ایک صفت امن قائم کر سکتی ہے۔

لچک پیدا کرنے کی انتہا دیکھیے لکھتے ہیں کہ

''کیا حرج ہے کہ میں آج چھپ کر بھی گائے کی قربانی نہ کرسکوں۔ یہ کوئی پن کا کام تو ہے نہیں اور پھر کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا اگر میں اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھوں۔ خط کا مضمون تو وہی رہے گا۔''

یہ اس وقت کے ایک مسلمان مصنف کی امن کے لیے ایک انتہائی کوشش کہی جا سکتی ہے کہ وہ ہر ایک بات میں لچک نکال رہا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ ہندو شدت پسند ہیں اور یہ بھی کہ وہ مسلمانوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ اسی افسانے میں ان مصائب و آلام کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں جو مسلمانوں کو درپیش ہیں لیکن پھر بھی امید کا دامن تھامے ہوئے ہیں کہ حالات بدل بھی سکتے ہیں۔ اگر ہم کم تعداد میں ہیں تو ہمارا ہی فرض بنتا ہے اپنے ہندو بھائیوں کو اپنی وفاداری اور برابری کا یقین دلاتے رہیں۔

غلام عباس مسلمانوں کو درپیش مسائل سے پوری طرح آگاہ تھے لکھ بھی رہے ہیں لیکن

اس سب کے باوجود رویوں میں لچک نکال کر امن کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ گلاب

"سرخ گلاب" ایک طویل افسانہ ہے اسے علامتی افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ سرخ گلاب کو ایک وحشی گلاب کے طور پر لیا جاتا ہے۔ یہ محبت کی وحشت ہے۔ جنگلی گلاب محبت کی نشانی ہے۔ غلام عباس جیسے ماہر افسانہ نگار نے بہت حساس موضوع پر یہ افسانہ لکھا ہے۔

مرکزی کردار "کاکی" کی صرف ماں تھی جو نائن تھی۔ دیہات میں یہ کردار عام طور پر بڑے گھروں میں کھانے پکانے، بچے پالنے والی عورت کو کہتے ہیں۔ یہ بچی اس نے کیسے پیدا کی اور اس کا باپ کون تھا یہ بات کسی کو نہیں پتا۔ کسی کو اس سے دلچسپی بھی نہیں۔ بچی جس کا نام کاکی رکھ دیا گیا وہ بھی گاؤں کے گھروں میں مفت کی نوکرانی میسر آ گئی۔ اس افسانے میں منظر نگاری خوب اچھی اور باریک بین کی گئی ہے۔ ماحول کا نقشہ کھینچ کے اور کرداروں کے مشاغل سے اصل مدعا جو کہ اندھی مذہبی عقیدت ہے۔ اسکی نشاندہی کی گئی ہے۔ پیر حضرات کے مزاروں پر جا کر دھاگے باندھنے سے بچے کس طرح پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرتی المیے ہیں جن پر لکھنا بھی ایک طرح کا جہاد ہے۔ اس افسانے کے کردار اپنی طرز زندگی کو خود دکھا رہے ہیں۔ گاؤں کے ماحول میں سادگی صرف اسی ایک کردار کاکی میں ہی ہے جو اب بچی سے جوان ہو چکی ہے۔ جسے دنیا کا زیادہ علم نہیں۔ جو نیم پاگل ہے۔

کاکی کو مرکزی کردار بنا کر مصنف نے سماجی برائیوں اور نیت کی کمینگی کو کئی کرداروں اور مثالوں کے ذریعے عیاں کیا ہے۔ ایک کمزور اور لاوارث لڑکی کا معاشرہ کیا حال کرتا ہے۔ پھر حویلیوں کے اندر کیسے کیسے راز چھپے ہوئے ہیں۔ جو اس افسانے میں اپنی کراہیت زدہ شکل کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ جیسے کہ گنڈیریاں لگانے والا "مولا" اس پاگل سی لڑکی کی لاپرواہ اور چڑھتی جوانی کو حریص نظروں سے دیکھتا ہے اسے گنڈیریاں کھانے کا لالچ دیتا ہے۔ لیکن اس بیچاری کو زندگی میں کچھ اچھا نہیں ملا تھا یہ بھی وہ حاصل کرنے کی سمجھ ہی نہیں رکھتی تھی۔ وہ تو گانٹھیں کھا کر ہی خوش تھی۔ اور گاؤں کی امیر عورتیں جب منتوں مرادوں کے لیے شاہ ولی کے عرس پر مزار جاتی ہیں تو اسے بھی ساتھ لے جاتی ہیں۔ وہ معصوم اور دنیا کی چالاکیوں سے بے خبر ہے۔

وہ بھی ان سب عورتوں کی طرح اور اپنی ذیلدارنی کے طرح اپنے لیے بچے کی خواہش اور دعا کرتی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ شادی شدہ عورتوں کو ہی بچے پیدا کرنے کی خواہش اور اجازت ہے۔ وہ شادی شدہ ہو کر جیسے بھی اپنی اس خواہش کو ممکن بنا لیں وہ جرم نہیں لیکن اس معصوم کاکی کو کوئی سمجھانے یا سنبھالنے والا نہیں۔ ذیلدارنی اسے سرخ گلابوں والی قمیض پہنا کر تیار کر لیتی ہے اور ساتھ لے جاتی ہے۔ کاکی کو وہاں گنڈیریاں بیچنے والا مولا بھی نظر آتا ہے۔ وہ تو سرخ گلابوں والے کپڑوں میں سجی سنوری جھلی سی کاکی کو پہچان ہی نہیں پاتا۔ حیران پریشان ہو کر حرص زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہ

جاتا ہے۔
مصنف نے کاکی کا پیٹ سے ہونا اور اس کی ابتدائی علامات ظاہر ہونے پر اس کم عقل کی خواہش پوری ہونے پر خوش ہونا اس مہارت سے دکھایا ہے کہ کہیں بھی اس کی گرفت افسانے پر کمزور نہیں ہوئی۔ اسکے ساتھ ہی دوسروں کا اس سے نفرت کرنا اور اسے علاقے سے باہر پھینک دینا ہمارے معاشرے کے دوغلے پن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پھر عرس قریب ہے پھر عورتیں تیار ہو کر اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے دور دراز سے اپنے شوہر یا گھر والوں کے ساتھ مزار پر آتی ہیں۔ انتہائی تہذیب سے مصنف نے اس بدتہذیب سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔ آخر تک تجسس برقرار رہا ہے۔ کہ کاکی کے بیٹے کا باپ کون تھا۔ اس جیسے سیدھے اور کم عقل لوگوں کو بھی ظالم سماج معاف نہیں کرتا۔ آخر کار وہ جھنجھلا جاتی ہے۔ جو مرد کتوں کی طرح اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں وہ انھیں کاٹ کھانے تک کی نوبت پہ آجاتی ہے۔ انسانیت کا فقدان اور حرص ہوس کی زیادتی نے اس افسانے کو بہت خاص رنگ دیا ہے۔ اس مہارت سے افسانہ نگار زمانے کے بے رحم رویوں کو بے نقاب کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔
شروع میں جب افسانہ نگار نے اس پاگل سی لڑکی کے بارے میں کچھ ایسا نقشہ کھینچا۔
”وہ سارے کام ہنسی خوشی کیا کرتی۔ کسی کسی دن گاؤں والوں کی بکریاں چرانے پہاڑوں پر لے جاتی جہاں چن شاہ ولی کا مزار تھا۔ اور صلے کا خیال تک نہ آتا کسی نے کچھ روکھا سوکھا دے دیا تو کھا لیا۔ پھٹا پرانا کپڑا دے دیا تو پہن لیا۔ وہ اپنے حال میں مست تھی۔“
لیکن ہمارا معاشرہ جو انسان کے وجود میں حیوانوں سے بھرا ہوا ہے ایسی معصوم، اللہ لوک لڑکی کو بھی معاف نہیں کرتا۔ ہر لحاظ سے زندگی اس پر تنگ کر دی۔ پھر بھی عزت کے دوہرے معیار ہیں کہ جب وہ حاملہ ہو گئی اور وہ بیچاری اپنی خطا سے بے خبر تھی اسے ہی نفرت کا نشانہ بننا پڑا اور گاؤں کی عزت کو وجہ بنا کر دور جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن وقت بھی بہت بے رحم ہے انہی لوگوں کو پھر اس کے سامنے لا کھڑا کیا یہ سفاک شکاری اسے پھر بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ تو اختتام تک اس لڑکی کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ
”اب گاؤں کے آدمی اسے پکڑنے کے لیے دوڑے۔ مگر وہ ان کے آگے آگے ہی رہی، ایک دفعہ تو دو آدمیوں نے پکڑ بھی لیا۔ لیکن وہ وحشی بنی ہوئی تھی۔ ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔ یہ تعاقب رات بھر چلتا رہا۔“
یہی وہ لوگ تھے جو اسے اس کی خدمات کے صلے میں ایک وقت کی روٹی اور رہائش نہیں دے پائے تھے اسے بے عزت کر کے اور گناہ گار بنا کر جنگل میں چھوڑ گئے تھے اب جب سب ایک ساتھ اس پر جھپٹ پڑے تو وہ بھی وحشی بن گئی یہاں تک کہ اس نے ایک شخص کا کان ہی کاٹ ڈالا۔ کیونکہ وہ ان درندوں سے خود کو بچانا چاہتی تھی۔ غلام عباس کہانی میں جزئیات نگاری ایسی کمال کرتے ہیں کہ مناظر قلم کی طرح ذہن کے پردہ سکرین پر ابھر آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

خوشبو آواز دیتی ہے کا فکری تجزیہ

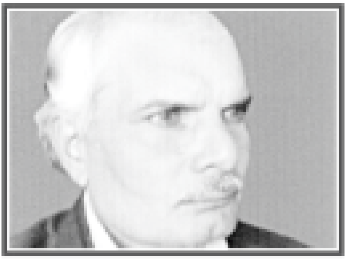

نوعِ انسان کو زندان میں لانے والا
کتنا ظالم تھا یہ زنجیر بنانے والا

....

روسو جیسے انسان دوست فلسفی نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن اسے زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ نثار ترابی کا یہ شعر حالیہ مادیت کے تناظر میں تاریخ انسانی کے بھیانک کرداروں کو بے نقاب کرتا ہے کہ جس میں پاپائیت مذہبی پیشوائیت نے سادہ لوح انسانوں کو دیوتاؤں (خداؤں) کے قوانین کی زنجیروں میں نہ صرف قید کیا بلکہ ہر دور کے سفاک سلاطین کے سیاسی، سماجی اور معاشی ظلم و استبداد کی معاونت بھی کی۔ اس دور سے انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال شروع ہوا۔ ظلم تو یہ ہے کہ انھیں تقدیر پرستی کا ایسا درس دیا گیا کہ وہ غربت و افلاس میں صبر اور شکر کا ورد کرتے کرتے دنیا سے اٹھ جائیں تاکہ ان کا ہر طرح سے استحصال کیا جا سکے اس دور سے لے کر تادم تحریر استحصالی قوتوں کا بھیانک کردار ہر ذی شعور کے سامنے ہے۔

چوں کہ نثار ترابی طبقاتیت کا مکمل مطالعہ رکھنے والے سخن ور ہیں اس لیے وہ موجود عہد کو خوں چکاں حالات وواقعات سے باخبر ہی نہیں بل کہ ان کا برملا اظہار کر کے قالبِ شعر میں سمونے کا کمال ہنر رکھتے ہیں۔

نثار ترابی سیاسی، فکری اور معاشی انقلاب کے داعی ہیں اس لیے ان کا ہر ہر مصرع ایک ایسے مثالی معاشرے کا آئینہ دار ہے جس میں طبقاتی کے بجائے مساواتی نظام ہوان کی تمنا کی بستی میں مذہبی، سیاسی، گروہی مفادات میں ہی نہیں بل کہ طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں ہر شعبہ زندگی مفلوج بھی ہے خوف و ہراس کا ایسا ماحول ہے کہ سانس لینا بھی دشوار ہے غرضیکہ ہر وہ قباحت ہے جو ایک نوآبادیاتی کالونی میں ہونی چاہیے۔ کئی صدیوں سے استحصالی قوتوں کا یہی مقصد رہا ہے کہ وہ اقتدار میں رہ کر ملکی دولت اور ذرائع پیداوار پر غاصبانہ قبضہ جمائے رکھیں، تا کہ عوام مسائل کی آگ میں جلتے اور فاقوں سے مرتے رہیں۔

نثار ترابی کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے جو استحصالی قوتوں کی خباثتوں سے نفرت اور انتقام کے جذبے بڑھاتے ہیں۔

جسارت خیالی

انھیں سکھایا ہے کس نے ہنر سیاست کا
یہ لوگ کون ہیں کیوں داستاں بدلتے ہیں

ہمارے عہد میں یہ کیسا عذاب اترا ہے
کہ لفظ لفظ ہے جھوٹا اثر ہے بے معنی

ہے جس پہ منحصر ساری گواہی
کہانی کا وہی کردار چپ ہے

لٹیرے دندناتے پھر رہے ہیں
تعجب ہے کہ پہرے دار چپ ہے

کیسے سامان ہو گئے چپ چاپ
شہر سنسان ہو گئے چپ چاپ

حرص و ہوس کی پوجا اکثر
بستی جنگل کر دیتی ہے

کب تلک بارود، گولی کی زباں بولو گے تم
اس صدی کے وحشیوں سے پوچھتی ہے فاختہ

....

ایسے نظام زندگی سے ہر فرد میں احساس بیگانگی پیدا ہوتا ہے وہ پھر اپنی روایات تہذیب و ثقافت مذہب اور اپنی ذات سے کٹ جاتا ہے وہ بستی میں زندہ لاش کی طرح ہوتا ہے نثار ترابی کا یہ شعر فلسفہ بیگانگی کی خوب آئینہ داری کرتا ہے۔

کچھ اس طرح سے کٹے ہیں وجود سے اپنے
ہم اپنے قلب و نظر کی خبر نہیں رکھتے

....

اس کے باوجود نثار ترابی قنوطیت کے بجائے پر امید ہو کر کہتے ہیں، کہ تمنا کی بستی میں کانٹے نہیں رہتے ریشم ہوں گے، اجالوں کا قافلہ ضرور اترے گا پھر ہر طرف ارفع اخلاقی اقدار کی خوشبو ہوگی۔

کوئی اجالوں کا ہم سفر بھی آئے گا ایسا
جو میری بستی کا بجھتا دیا جلائے گا

عزم پھیلے گا سرخرو ہو کر
حوصلہ جسم و جاں بدلے گا

میں ایک دشت کو سیراب کرنے آیا ہوں
جبھی تو کالی گھٹائیں ہیں ہم سفر میری

....

نثار ترابی جیسے بیدار مغز شاعر کے ہاں وجدان بھی ہے اور سوز دروں بھی اس لیے مشاہداتی حس نے انھیں کندن بنا دیا ہے وہ اپنی انقلاب آفریں شاعری کے ذریعے شعور ذات دنیا اساطیری روایات اور اوہام و خرافات کی دلدل سے نکالنا ہمہ قسمی تعصب کے شعلوں کو بجھانا، تخریب سے نفرت اور تعمیر کے جذبوں کو اجاگر کرنا اور معاشی مساوات پر زور دینا اپنا مقصد حیات سمجھتے ہیں۔

نثار ترابی کے ہاں اظہار کا قرینہ بھی ہے اور نئی نئی تراکیب، استعارات، تشبیہات تراشنے کا ہنر بھی۔ اس کے علاوہ قوافی اور ردیفوں کا حسن ربط بھی کمال ہے۔ جیسے نظر کو پردیسی، سحر کو پردیسی، غبار میں گم، مداد میں گم، نظر میں گلاب، اثر میں گلاب، جہاں ہے خوابیدہ کارواں ہے خوابیدہ وغیرہ وغیرہ۔

مختصر یہ کہ نثار ترابی کی شاعری میں جذبے کی صداقت بھی ہے فنی فکری پختگی، تازگی اور بے ساختگی بھی۔

دعا ہے کہ نثار ترابی کے انسان دوست افکار کی خوشبو نام نہاد بہروں، بے ضمیروں اور بے حس لوگوں تک پہنچے، تاکہ ان کے دل و دماغ سچائی سے معطر ہوں اور ایسا انقلاب آئے کہ ارفع اخلاقی اقدار کے زمزموں کی گونج سنائی دے۔

☆☆☆☆☆

ریاضِ نعت اور نوالِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

شمیم حیدر ترمذی

ایک عظیم صوفی نے کہا، ''ہمارے رسولؐ معراج پر گئے اور ایسے مقام پر پہنچے جہاں معبود اور عبد کے درمیان دو قوسوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ تھا۔ ہمارے رسولؐ وہاں سے واپس آ گئے، میں ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا، اتنا قریب پہنچ کر اللہ کی ذات میں گم ہو جاتا ـــــ'' اس بات سے صوفی اور نبیؐ کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ صوفی کی زندگی کا مقصد ''فنا فی الذات الٰہی'' ہے۔

جبکہ نبیؐ کا مقصدِ حیات دنیا میں واپس آ کر انسانیت کی ہدایت ہے۔ معراج سے واپس آ کر دنیا والوں کو اللہ کے راستے پر چلانا، ان کے کردار کی تہذیب و تطہیر کرنا اور قیامت تک کے لیے اسوۂ حسنہ کو نبی نوعِ انساں کے لیے نظیر بنا کر پیش کرنا، نوالِ مصطفیٰؐ کہلاتا ہے۔

ہمارا نعت گو شاعر جب جمالِ مصطفیٰؐ کو بیان کرتا ہے تو محبانِ رسولؐ عشقِ رسولؐ کی منزل پر پہنچتے ہیں۔

جنابِ مصطفیٰؐ کے جمال، کمال اور نوال کو ہم تک پہنچانے کا کام ریاض زیدی ایسے نعت گو شعرا نے کیا اور عین عبادت سمجھ کر کیا۔

ہم ان شعرا کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے ایک طرف اپنی شفاعت کا اہتمام کیا تو دوسری طرف اللہ اور رسولؐ کی محبت کو اہلِ ایمان کے دلوں میں ڈال کر انھیں شائستگی افکار اور تہذیب کردار کا روشن راستہ دکھایا۔

سید ریاض حسین زیدی کی نعتوں کے چار مجموعے ریاضِ مدحت، جمالِ سید لولاک، ذکرِ شہہ والا اور اے رسولِ امیں میرے سامنے ہیں۔

شاعر نے عام ڈگر سے ہٹ کر، جمالِ مصطفیٰؐ اور کمالِ مصطفیٰؐ سے کہیں زیادہ نوالِ مصطفیٰؐ کا ذکر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ آج کی امتِ مسلمہ کی ضرورت ہے۔

چند منتخب اشعار دیکھیے:

جمالِ انبیاء رشکِ قمر ہے
ولیکن آپ کی شان دگر ہے

ذکر ہے آپؐ کی زیبائی کا
کیسا مضموں ہے دل آرائی کا

....

آپؐ کا حسن مجسم دیکھے
حوصلہ کب ہے یہ بینائی کا

....

سید ریاض حسین زیدی نے اپنی نعتوں میں حضورؐ پاک کے کمالات اور معجزات ذکر ضرور ملتا ہے لیکن جمال مصطفیٰؐ کی طرح کمال مصطفیٰؐ کا بیان بھی زیادہ نہیں۔ شاعر نے کمالات اور معجزات کا ذکر ضرور کیا ہے۔ اس عنصر سے متعلق چند منتخب اشعار:

کمال نبوت کے اعجاز دیکھوں
نئے سے نئے اس کے انداز دیکھوں

....

ہیں معجزات آپؐ کے بے مثل ولاجواب
مولائے کل ہیں، آپ کو سب قدرتیں ملیں

....

آخر میں اس عنصر یعنی نوال مصطفیٰؐ کی بات، جو سید ریاض حسین زیدی کی نعت میں سب سے زیادہ صراحت کے ساتھ آیا ہے ۔ شاعر نے رسولؐ پاک کی اس عطا اور بخشش کا حال بہت کھول کر بیان کیا ہے، جو ہر دور کے انسان کے لیے کامیاب عملی زندگی میں مددگار اور مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

آئے حضورؐ سارا زمانہ بدل گیا
خیر عمل کی روح رچی انقلاب میں

....

وہ ذرہ ناچیز کو خورشید بنا دیں
پستی کے مقدر میں یہاں اوج لکھا ہے

....

نوال مصطفیٰؐ کا آخری درجہ "پیروی رسولؐ" ہے کیونکہ اطاعت رسولؐ دراصل اطاعت الٰہی ہے۔ اللہ تک پہنچنے کا سب سے محکم اور یقینی وسیلہ حضورؐ کی تقلید ہے ۔

انسان کا شرف محمدؐ کی غلامی سے مشروط ہے ۔ انسان کی خلافت ارضی و نیابت الٰہی، اسوہ رسولؐ کو اپنانے اور اپنی زندگی جاری وساری کرنے میں ہے۔

تالیف قلب ہی تو ہے تسخیر کائنات
سیرت، رسولؐ پاک کی رکھتی ہے دلکشی

رمز حیات آپؐ ہی کی پیروی میں ہے
اصل حیات وزیست ہے تقلید آپؐ کی

☆☆☆☆☆

تتلی نگر — ایک ہمہ رنگ جہانِ حیرت

سلمان یوسف سمیجہ کی کتاب ''تتلی نگر'' بچوں کے ادب میں ایک دلکش اضافہ ہے۔ کہانیوں کا یہ مجموعہ ایک ایسی دنیا کا در کھولتا ہے جہاں رنگ، خوشبو اور تخیل سب مل کر ننھے دلوں کو روشن کرتے ہیں۔

کتاب کی کہانیاں رنگین تتلیوں کی مانند ہیں، جو اپنے اپنے پَروں پر نیا تاثر اور نیا سبق لیے ہوئے ہیں۔ سرورق کہانی ''تتلی نگر'' میں معصومیت اور فطرت کا حسین امتزاج جھلکتا ہے۔ ''مانی میاں کی کہانی'' برجستہ مکالموں پر مشتمل ہنستی مسکراتی کہانی ہے۔ ''انار کا انٹرویو'' معلومات کے موتی بکھیرتی ہے۔ ''خاموشی'' بچوں کو ماں جیسے رشتے کی اہمیت سکھاتی ہے۔ ''باموخرگوش اور جافو ہاتھی'' خلوص کی طاقت کو نمایاں کرتی ہے۔ ''دو پھول'' خوش اخلاق بننے کا درس دیتی ہے۔ ''شانی ہتھنی'' جستجو، محنت اور حوصلے کی تربیت فراہم کرتی ہے۔ ''پھولوں کی سیج اور سبزے کا قالین'' بچوں کے اندر یقین کا چراغ روشن کرتی ہے۔ ''ٹوبو کی ڈائری'' ڈائری لکھنے کے فوائد سے آگاہ کرتی ہے۔ ''تعاقب'' ہنساتی ہے۔ ''تمریز، دو کوے اور ایک جگنو'' اندھیروں سے نکلنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ''پھولوں کا سکول'' علم کی خوشبو اور خوشی بانٹنے کی خوبصورتی بیان کرتی ہے۔ ''دیگچی میں ہنگامہ'' اتحاد کا سبق دیتی ہے۔ ''تمریز کا جھولا'' دلچسپی سے بھرپور ہے۔

کہانیوں کی زبان سادہ مگر دل نشین ہے۔ ہر کہانی ایک نغمگی رکھتی ہے، جو قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ عنوانات کے چناؤ میں تخلیقی بصیرت جھلکتی ہے، جو بچوں کی جستجو کو ابھارتی ہے اور بڑوں کو بچپن کی وادیوں میں لے جاتی ہے۔

کتاب کی طباعت، سرورق اور پیش کش بھی قابلِ تعریف ہے۔ یہ سب خوبیاں مل کر ''تتلی نگر'' کو شاندار تخلیق بناتی ہیں۔ یہ کتاب لائبریریوں اور سکولوں کی الماریوں کے ساتھ ساتھ گھروں کی بھی زینت بننے کے قابل ہے۔

آخر میں کہا جا سکتا ہے کہ ''تتلی نگر'' کہانیوں کا گلستان ہے۔ یہ بچوں کے لیے روشنی کا چراغ ہے، جو انہیں بہترین انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے اور ان کی سوچ کو پروان چڑھاتا ہے۔

کاوش صدیقی

حمدیہ قصیدے کی بازیافت

حمد کی تخلیق براہ راست عبادت کے زمرے میں داخل ہے۔ قصیدے کی صورت میں حمد کا یہ سفر علی عادل شاہ ثانی متخلص بہ شاہی دکنی سے شروع ہو کر میر تجلی، ولا، انشا، مصحفی، ممنون، مومن، سالک، صفدر رام پوری، مہر نرائن، تمنا مراد آبادی، ابراہیم آزاد، اثر زبیری اور مولانا ظفر علی خاں سے رعنائی و توانائی حاصل کرتا ہوا عباس علی شاہ ثاقب تک پہنچا ہے۔ مہر نرائن نے تصور خدا کے ساتھ توحید کی فلسفیانہ بنیادوں پر شرح کرتے ہوئے خدائے مطلق کو وجود واجب قرار دیا ہے۔

مصحفی کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایک ہے لیکن وہ عددی تقسیم سے پاک ہے یعنی ایسا واحد و یکتا ہے جس کا نصف ممکن نہیں۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تمنا مراد آبادی نے صفات خداوندی کو اجاگر کرنے پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔ الغرض حمدیہ قصائد کی یہ روایت عبادت کے علاوہ معرفتِ ربانی کا سرچشمہ بھی ہے۔

عباس علی شاہ ثاقب کے حمدیہ قصائد کائنات کے مشاہدے کی دعوت کا مظہر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر استفہامیہ انداز میں قاری کو حکمت و قدرت الٰہی کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے کی طرف راغب کیا ہے۔ مثال میں یہ اشعار دیکھیں:

چلو پوچھیں ستاروں کے جہاں سے
ضیا اس کو ملی کس آستاں سے؟

فلک قائم ہے کیسے بن ستوں کے؟
سہارا اس نے پایا ہے کہاں سے؟

....

عباس علی شاہ ثاقب کے حمدیہ قصائد میں قصیدے کا مکمل شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے چودہ قصائد میں تشبیب، گریز، مدح اور حسنِ طلب کے عناصر پوری آب و تاب سے جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ یہ شعور انھیں اپنے ایم فل کے مقالے "پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری" کی تکمیل سے حاصل ہوا۔ ان کی یہ دونوں کاوشیں صنفِ قصیدہ کی بازیافت قرار دی جا سکتی ہیں۔

تمنا مراد آبادی کے حمدیہ قصائد کے مجموعے "تمہید ایماں" 1891 کے بعد "نورِ توحید" اس حوالے سے امتیازی تشخص کا حامل ہے کہ اس میں تمہیدیہ قصائد کا اہتمام ملتا ہے۔ جہاں تک تشبیب کا تعلق ہے تو عباس ثاقب کے ہاں اخلاقی اور اصلاحی مضامین ملتے ہیں۔ جن میں خوشامد، سیاسی زوال، شہر آشوب اور علم کی اہمیت شامل ہیں۔ ایک قصیدے "نور العالمین" کی تشبیب نے اردو شاعری کی روایت میں تازگی کا احساس پیدا کر دیا ہے جو قابلِ تحسین امر ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

نوید عاجز

سب مظاہر نے کہا باقاعدہ
کیجیے حمد و ثنا در ریختہ

ریختہ کہ میر ہیں جس کے خدا
میر جو کہ غم سے تھے آراستہ

ریختہ جس میں ولی کے فیض سے
ہے جمال و حسن کا اِک سلسلہ

....

ان حمدیہ قصائد کے گریز، مدح و تشبیب سے ہم آمیز ہو کر نظم کو مربوط کرتے نظر آتے ہیں۔ گریز کے اشعار میں اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ایک دو شعروں میں ہی مدح کی طرف رجوع کا مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔ گریز میں استفہامیہ روش یا تکنیک کا استعمال شاعر کو زیادہ مرغوب ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

بدلتی رات ہے یہ دن میں کیسے؟
کہ لاتا کون ہے شب آسماں سے؟

کہا سب نے خدائے لم یزل ہے
کیا تخلیق جس نے "کن فکاں" سے

....

عباس ثاقب کے قصائد میں حمد و ثنا کے موضوعات کا بنیادی سرچشمہ قرآن پاک کا نسخہ ہدایت ہے۔ ان میں قدرتِ الٰہی کا بیان بھی ہے اور حکمت خداوندی کے مظاہر کا ذکر بھی، ان میں وحدانیت کا اظہار بھی ہے اور شان ربوبیت کا اعتراف بھی، ان میں تخلیق ایزدی کی کرشمہ سازی کی جھلک بھی ہے اور بخشش و عطائے ربانی کی عظمتوں کا احساس بھی۔ ان میں معبودِ حقیقی کی یکتائی بھی جلوہ گر ہے اور بے انت صفات کاملہ بھی۔ یہاں اللہ رب العزت کی عطا کردہ نعمتوں کے ذکر میں یہ اشعار دیکھیے جو شاعر کی قوت مشاہدہ کے غماز ہیں:

آنکھ بھی دی ہے نظاروں کے لیے
فضل تیرا ہے عطائے سامعہ

حمد تیری خلوت و جلوت میں ہے
ہے کرم تیرا یہ وصفِ ناطقہ

یوں ہم قرآن تیرا رکھ سکیں
سیکھنے کے واسطے ہے حافظہ

....

سلسلہ حسن طلب میں شاعر نے داخلی کیفیت اور تمناؤں کے علاوہ امت مسلمہ کی بھلائی اور خیر خواہی طلب کر کے اپنی انسان دوستی اور دردمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دعا تکرار کے ساتھ "نورِ توحید" کی کی قبولیت اور مقبولیت کے حوالے سے نمایاں ہے۔

کلاسیکی قصیدہ نگاروں کے ہاں بلند تخیل، لفظی جوش و جمال، معنی آفرینی اور نازک خیالی کی صفات ملتی ہیں اور یہی اسلوب اور انداز بیاں قصیدے کا معیاری وصف سمجھا جاتا تھا لیکن جدید دور میں خالد احمد نے نعتیہ قصائد کے مجموعے "تشبیب" میں قصیدے کو وارفتگی، سادگی، خلوص اور سہل ممتنع کی روش سے ہم کنار کیا ہے۔ عباس ثاقب نے اس جدید روش سے سادگی اور بے ساختگی کو اپناتے ہوئے حمد کا مدعا پیش کیا ہے۔ بیانیہ لہجہ، استفہامیہ انداز اور مشاہداتی طرز ادا زیر موضوع حمدیہ قصائد کا اسلوب نمایاں کرنے کے اہم عناصر قرار دیے جا سکتے ہیں۔

عباس ثاقب نے حمدیہ قصیدے کی صنف کو جس خلوص اور وارفتگی سے موضوع بنایا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ امید ہے کہ "نورِ توحید" عصر حاضر کے شعرا کو حمدیہ قصیدے کی طرف مائل کرنے میں اہم پیش رفت ثابت ہو گا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

خالد محمود کی نظمیں: نیا بیانیہ

سائنسی روشن خیالی اور سرمائے کے نظام نے انسان کو بہت سے قطعات میں بانٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ دونوں مغرب کی عطا ہیں۔ ان دونوں کے تجربات نے انسان کو بہت بھیانک اور درد سے بھرے عہد سے گزرا ہے۔ انقلابات کے بعد جب نئی دنیا کی تلاش ہوئی، تو اس کے نتیجے میں نیا انسان سامنے آیا۔ جدید انسان نے اقتدار اور وجودیت کے شوق میں خود کو روایات سے آزاد کر لیا۔ ظاہر ہے ان چیزوں نے افلاس، بھوک، جہالت اور بے شعوری کو پروان چڑھایا۔ مغرب عقلی اور منطقی بنیادوں پر ترقی تو کرتا رہا مگر انسانیت کو کہیں دور بہت دور گم کر بیٹھا۔ مشرق جس کی ابتدا ہی انسانی روایات سے ہوئی وہ سب کچھ رکھنے کے باوجود بھی مغرب کی طرف ہی دیکھ رہا ہے۔ اردو شاعری نے ایسے شاعر پیدا کیے جن کے ہاں ہمیں روحانیت کا انداز، اپنی مٹی کی خوشبو، خود کو جاننے کی آرزو، تلاش اور منزل تک پہنچنے کی بات نظر آتی ہے۔ اس چیز کو سمجھنے کے لیے ہمیں حالی، اقبال، مولانا ظفر علی خان، حسرت موہانی اور فراق جیسے شاعروں کی شاعری کو سمجھنا پڑے گا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس ترقی نے انسان کی آسائش اور رہنے میں سہولت دی مگر جینے میں مشکلات پیدا کر دیں۔ مغربی شاعری کی نسبت اردو شاعری میں جدید نظم کا تصور انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ڈاکٹر لائٹنر اور مولانا محمد حسین آزاد کی بدولت اردو میں آیا۔ یہ نظموں ایک طے شدہ طریقہ کار کے تحت عنوانات دے کر شاعروں سے نظمیں لکھوائی جاتی اور مشاعروں میں پڑھوائی جاتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ 10 مشاعروں کے بعد ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ پھر ہمیں قریب قریب پچاس سال تک خاموشی نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے

آبگینہ شاہین

غزل کو عروج تھا۔ پھر ہمیں نظم میں ن م راشد، مجید امجد، میراجی اور فیض احمد فیض باقاعدہ نظم لکھتے نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے شاعری اور نظم کو عروج دیا۔ انھوں نے بہت سارے نئے موضوعات سے روشناس بھی کروایا۔ ان کی تخلیق میں فکری مربوط انداز نظر آتا ہے۔ سب کے ہاں ہمیں فکری میلان مختلف نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ راشد کی شاعری میں داستانوی عناصر، میراجی کے ہاں ہندی اساطیر، مجید امجد کے ہاں پنجاب ثقافت اور قدرت کے رنگ اور فیض کے ہاں ہمیں کلاسیکی ڈکشن میں رنگی وطنی محبت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں یہ بنیادی موضوعات ہیں۔ کئی دہائیوں کے بعد شعری روایت کروٹ لیتی ہے اور درجہ بہ درجہ تبدیلیوں کے بعد ہمیں نظم میں ارتقا نظر آتا ہے۔ ان دہائیوں میں ہمیں نظم کا پلڑا کہیں بھی زوال آمادہ نظر نہیں آتا۔ بل کہ پابند نظم سے نثری نظم تک کا درجہ بڑی ہی مہارت سے غزل کے عروج میں بھی نظر آتا ہے۔ نثری نظم نے داخلی اور خارجی ہیت میں نئی جہت اور منفرد بیانیے کو فروغ دیا۔ نثری نظم میں فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، عذرا عباس، سارہ شگفتہ، تنویر انجم، ثروت حسین اور موجودہ دور میں افضال احمد سید سامنے آتے ہیں۔ نظم جن کے قلم سے جلا پاتی

ہے۔ یہ اس سمے کی بات ہے جب نظم کی بھرپور مخالفت ہو رہی تھی۔ غزل لکھنا نظم لکھنے والوں کے لیے بھی سند کا درجہ ہوتا تھا۔ تب ان شاعروں نے نثری نظم کو تنہا نہیں چھوڑا، دیکھیے۔ اس کلیشے کو عذرا عباس نے توڑا جنھوں نے ایک بھی غزل نہیں لکھی۔ تمام شاعری ان کی نظموں پر مشتمل ہے۔ 21 ویں صدی میں نئے لکھنے والے بہت سارے شاعر نہ صرف سامنے آئے بل کہ انھوں نے اپنی شاعری سے لوگوں کی توجہ کو نئی سوچ دی۔ نجمہ منصور، کشور ناہید، عذرا عباس، عذرا پروین، نعمان شوق، نصیر احمد ناصر، احمد ہمیش اور نوجوان شاعر خالد محمود کوندل نمایاں ہیں۔ اگرچہ ان کی شاعری اپنے قدما کے جیسے روایتی خول میں بند نہیں بلکہ ان کے ہاں موضوعات میں صد رنگی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں آج کا انسان بولتا ہے۔ ذاتی تجربات ہیں۔ ان کی شاعری انسانی باغ کے گرد گھومتی ہے۔ وہ انسان کے اندر کے گہرے کرب کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کو زبان دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان نیکی اور بدی کا گہوارہ تو ہے ہی مگر ان کا پلڑا انسانی مزاج اور آزادی کی طرف ہی جھکتا ہے۔ خالد محمود کے ہاں انسانی مزاج کی نزاکت ہے۔ ان کی نظموں کی آنکھوں میں جمالیات ہے۔ مناظر اور

ان کی جزئیات ہیں۔ جزو میں کل کی ساری تخلیق کو جمع کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔ ان کے ہیں امن کی گونج اور محبت کے استعارے ہیں۔

پچھتر نظموں پر مشتمل ”یادیں پرانی نہیں ہوتیں“ کے عنوان سے ان کا نظمیہ شعری مجموعہ اکتوبر 2022 میں شائع ہوا۔ خالد محمود کی نظم میں یہ خوبی ہے کہ وہ اس کو جس نقطے سے شروع کرتے ہیں، اسی نقطے سے انسان کی تہذیبی و تصوراتی سفر کی مکمل داستان کو نہایت منطقی انجام تک پہنچاتے ہیں۔ قاری جب ان کی نظموں کی قرات کرتا ہے تو وہ شاعر کے احساس میں شامل ہو جاتا ہے۔ آخر نظم میں انسان کا بہتر مستقبل روشن ہی نہیں روشن تر بھی سامنے آتا ہے۔ وہ تمام انسانی خوبیوں، خامیوں، کوتاہیوں کے ساتھ یہ باور کر لیتے ہیں کہ ہر حال میں یہی ان کا مقدر ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ اس نقطے تک پہنچ جائے جہاں دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ دوئی کا تصور مٹ جاتا ہے۔ نظم میں کہانی وہی ہے۔ آغاز بھی وہی ہے۔ اور یقین جانیے ہوگا بھی یہی:

ہم ایسے پیڑ ہیں
کہ جن پر
موسمِ بہار میں بھی
کبھی سبزہ نہیں اُگتا
پھول نہیں لگتے
پتے نہیں اُگتے

(ص،28)

جو تمام رشتوں پر
حاوی ہونے لگتا ہے
تمام رشتے اسی رشتے
میں ضم ہونے لگتے ہیں
اپنی آنکھوں کو
نہیں دیکھا تو، اب دیکھ لو!

(ص،29)

نثری شاعری کی سب سے بڑی آزادی میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں سب کچھ کہنے میں آزادی میسر رہتی ہے۔ یہ وہ آزادی ہے جو غزلیہ شاعری میں کہاں؟۔ اس آزادی کو ہرگز نثری نظم کا عیب نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ آزادی صرف خالد محمود کے ہاں ہی نہیں بل کہ ان سے پہلے کے نثری شاعروں میں بدرجہ غایت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز میں ہی ان سب کو اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ اعتراضات کرنے والوں میں اردو کے جید شاعر اور تنقید نگار بھی شامل تھے۔ اس مضمون میں ان پر تنقید کرنا شامل نہیں بلکہ نثری نظم کی جو متنوع خوبیاں خالد محمود کی نظموں میں نظر آتی ہیں ان کو اجاگر کرنا ہے۔ شاعر کا سب سے بڑا منصب یہ ہے کہ وہ ناموجود کی تخلیق

کرتا ہے اور جو پہلے سے موجود ہے اس کو
تخلیقی رنگ میں سما کر، جذبات واحساسات کی
سطح پر لے آتا ہے۔ اس لیے نثری نظم کا مزاج
جداگانہ ہے ۔نثری شاعری بلاواسطہ اور
بالواسطہ ناموجود سے موجود میں پناہ لے لیتی
ہے۔ان کے ہاں اس بیانیے نے اپنی پوری
توانائی کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو متوجہ کیا
ہے۔ان کی نظمیں صرف اپنے گرد نہیں گھومتی
بل کہ ہمارے معاشرتی رویے اور ہماری سماجی
برائیوں کی طرف بھی اشارہ کرتیں ہیں۔عالمی
سطح پر جو غیرانسانی رویہ ترقی پذیر ممالک کے
ساتھ روا رکھا جا رہا ہے یا اس سے عام انسان
کی زندگی میں جس قدر پریشانیوں میں اضافہ
ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے، ان وجوہات کو
بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔عالمی
سطح کے یہ ادارے انسانوں کے حقوق کی
حفاظت کے لیے بنائے گئے تھے مگر ایسے
اداروں میں ہی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے:

یو این او
ایک عالمی ادارہ ہے جو
انسانوں اور حکومتوں کو انصاف
دینے کے لیے بنایا گیا تھا
مسلمان یہ سمجھ بیٹھے کہ
یہ ادارہ
ان کے لیے بھی ہے
یہ ان کی سب سے بڑی بھول تھی
یہ ادارہ
عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں، سکھوں
نصرانیوں اور
دنیا بھر کے غیر مسلموں کے
تحفظ کے لیے وجود میں آیا ہے
جہاں کہیں
دنیا
مسلمانوں پر ظلم وستم
ہو رہا ہو
یہ آنکھیں موند لیتا ہے
اور کہیں
غیر مسلموں پر اک خروش بھی آئے
تو اس وقت اس کا
ضمیر پوری طرح جاگ پڑتا ہے
(ص،62،61)

جعلی اور نقلی ادویات
بنانے اور بیچنے والوں کے ضمیر
سوئے ہوئے ہیں
وہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں
جو دوائی ہزار روپے میں کوئی
خرید رہا ہے
اسے کیا پتہ ہے کہ وہ
دوا کے بدلے
زہر خرید رہا ہے اپنے پیاروں کے لیے
لیکن
جعلی اور نقلی

ادویات بنانے والوں کو تو علم ہے
وہ صرف
چند پیسوں کے لیے
لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں
اور حکومت
خاموش، بالکل خاموش

(ص 70)

یہ دو مثالیں اپ کے سامنے ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ جیسا رویہ رکھا جا رہا ہے اس کو مظاہرہ ہم اخبارات اور ٹی وی میں کرتے ہیں۔ اصل میں نا کام تو اقوام کے حقوق کی پاسداری تھا مگر اس کی بھاگ دوڑ تو طاقت ور لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ کب چاہیں گے کہ مسلمان پھر اقتدار میں آئیں۔ مسلم تاریخ پر زیادہ تر غلبہ مسلمانوں کا ہی رہا ہے۔ انھوں نے ہر شعبے میں ترقی کی۔ انسانیت پر ان کی بڑی خدمات ہیں۔ یہ سب دوسری اقوام کو کب بھاتا تھا، آج بھی ان کے خلاف سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ اس دنیا کی بنیاد معیشت پر ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیر دار لوگ ان کے تمام اصولوں سے واقف ہیں۔ اس لیے ان کے لیے انسانیت اہم نہیں بل کہ سرمایہ اکٹھا کرنا اہم ہے۔ چاہے کوئی زندہ رہے یا مر جائے ان کے لیے دونوں ایک ہیں۔ شاعر کے ہاں اس سنگ دلی کا نکتہ نظر واضح ہے۔ شاعر کی نظر میں کتنی وسعت ہے کہ دنیا کے سرمایہ دار انسانوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ کس طرح ان کی موت پر کھڑے ہو کر مال جمع کر رہے ہیں۔ شاعر اس کھیل سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس پر تنقید کرتے ہیں اور سادہ لوح انسانوں کو ہوشیار کرتے ہیں۔ اس سے عام آدمی میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے حقوق سے آگاہ ہوتا ہے۔ یہی شاعر کا وطیرہ بھی ہے کہ وہ اپنی شاعری سے شعور تقسیم کرے۔ جہاں یہ نظم کو درد سے شروع کرتے ہیں جیسا کہ اس مجموعے کی پہلی نظم کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں وہ انسانی زندگی اور انسانی زندگی میں جکڑنے والوں اداروں اور ان کے بنائے اصولوں سے خوب واقف ہیں۔ وہ عالمی سیاست کو بھی دیکھتے، سمجھتے اور پرکھ کر اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ عالمی سطح کے یہ پیمانے ہمارے معاشرے میں جس طرح لاگو کیے گئے ہیں اور اس کے جو نتائج آئے ہیں ہم سب اس سے بہ خوبی وقف ہیں۔ پہلی نظم سیاست اور دوسری نظم جعلی ادویات کو ایک ساتھ قرات کریں کہ یہ دوسری طاقت ور قوموں کا چہرہ آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیں گی۔ ایک نظم دوسری نظم کی ہی اگلی شکل ملے گی۔ ان کی نظموں میں یہ نوحہ موجود ہے کہ ہمیں عالمی سطح پر تو

مقید رکھا گیا ہے۔ ہماری تہذیب وروایات کا جہاں گلا گھونٹا گیا، انسانی معیار شوور وں ایسا مسلمانوں کو دیا گیا، اس سے سبق ہم نے نہیں سیکھا۔ ادویات کا کاروبار کرنے والے کس سے چھپے ہیں۔ یہاں انسانی رویے کی عکاسی بھی ہے کہ ہمیں مارا جا رہا ہے مگر اس کے باوجود بھی ہم خاموش ہیں۔ اپنے ہی لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ ان کی جانوں کو بے وقت سمجھ رہے ہیں۔ کیا انسانیت کی یہی معراج ہے؟

اردو کی نظمیہ شاعری میں اس طرح کا بے باک بیانیہ نظر نہیں آتا۔ یہی نثری نظموں کی آزادی ہے جس کو خالد محمود پوری طرح کام میں لاتے ہیں۔ اور وہ بات جس کو، جہاں سوچنے پر ہی پابندی ہو اس کو شاعرانہ رنگ میں رنگ کر کہہ جاتے ہیں۔ انھوں نے نظموں کو کئی منازل کے میں منقسم کیا ہے۔ بڑی خوب صورتی یہ ہے کہ ان کی منزل کہیں جا کر اختتام کو نہیں پہنچتی۔ ایک ان دیکھی دنیا ہے جس کو سر کرنے کے ارادے سے نکلتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں، میں نے ان کی نظموں سے ہی کچھ منازل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلی منزل میں ہمیں اپنی ذات کے درد کو تمام جہانوں کے درد سے ملایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ان کا اکیلے کا درد نہیں بلکہ بہت سارے ایسے بھی ہیں جن کے پاس یہ الفاظ نہیں ان کو زبان دی ہے۔ (ان کی نظمیں 'حیرت'، 'مٹی کی خوشبو'، 'ڈر' دیکھی جا سکتی ہیں)۔ دوسری منزل میں ہمیں اس دنیا میں موجود انسانی صورت حال کا پتہ چلتا ہے کہ انسان کیا تھا؟ اور کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ انسان خود ہی اپنی خواہش اور اقتدار کے ہاتھوں مجبور ہے۔ یقین جانیے کسی آدرش، نصب العین اور زندگی میں محبت نہ ہونے کی وجہ سے جو ایک تسلسل ہے وہ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ انسان دنیا میں گونگا، بہرہ اور لکڑیاں چننے کے لیے تو نہیں آیا۔ اس کائنات کی ساری رنگا رنگی انسان کے وجود سے ہے۔ اسی انسان کو نسل در نسل بھوک، دکھ، ظلم اور غم رہا ہے۔ جس کی تصویر ان کی نظموں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً دو نظموں کا انداز ملاحظہ ہو:

ہر طرف دکھ ہی دکھ ہیں
ہم نوا کوئی نہیں ہے
ایک گوشے میں پڑا ہوا ہوں
مجھے کوئی پوچھتا بھی نہیں
میں گم نام میں ادنیٰ سا
میری کیا وقعت

(ص 43)

یادیں زندگی کا
قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں
ان سے نجات اور
ان سے چھٹکارا پانا

گویا زندگی سے
چھٹکارا پانا ہے
یادیں اور پھر حسین یادیں
بھلانا بھی چاہیں تو
نہیں بھلائی جا سکتیں
کیونکہ
ان کے بغیر زندگی
کا کوئی جواز بنتا نہیں ہے
میرا
تو بالکل بھی نہیں----
(ص، 45)

''یادیں پرانی نہیں ہوتیں'' میں سب سے طویل نظم 'سنو جاناں' ہے جس میں محبت کے تجربے کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ محبت میں گرمی بھی، جس کو وطن کی محبت میں افضل مقام حاصل ہے۔ بہت سارے مناظر کو اپنے وجود میں سما کر تمام رنگ قاری کو دکھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایسی محبت بھی ہے جو شہر کے پرہجوم شور، پکے گھروں اور بند اندھیری گلیوں میں نہیں پھلتی پھولتی بلکہ بیری کے درخت کے سائے میں بیٹھے بیٹھے بیر کھانے سے پروان چڑھتی ہے:

سنو جاناں---
انہی دیرینہ رستوں سے بیری کے درختوں سے
پیلے، میٹھے بیر اب بھی برسیں گے
ہریالی سبز کھیتوں پر یوں تو اب بھی آئے گی
پر اب کے ان کی
قسمت میں وہ سبزہ نہیں ہوگا
کہ اب کی بار بیروں پہ کوئی قبضہ نہیں ہوگا
(ص 38)

ان کی نظموں میں تلمیحات کے لانے سے نظم کے مضمون میں تاریخ بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں کسی شہر کے لوگوں کا تجربہ نہیں بلکہ دیہات کی مٹی سے اُٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو میں لپٹا عاشق نظر آتا ہے، جس کے سانس سانس سے اپنی مٹی سے جڑت ملتی ہے:

اب کی بار میلے میں اسی بوسیدہ ٹھیلے میں
پھیری والا آئے گا اور میٹھے گیت سنائے گا
اس کے میٹھے گیتوں میں لہجہ تو وہی ہوگا
مگر بولی نہیں ہوگی
(ص، 39)

اسی نظم میں اسی جڑت سے تخلیقی رنگ یوں بھرتے ہیں:

سسی ہوگی، پنوں ہوگا، سوہنی اور مہینوال بھی ہوں گے
لیلیٰ جس سے ڈرتی تھی مجنوں کے وہ حال بھی ہوں گے
عشق کی داستانوں میں اک تاثیر بھی ہوگی
رانجھا بھی ہوگا اور اس کی ہیر بھی ہوگی
(ص، 39)

ان کی نظم میں ایسے مضامین بھی پائے جاتے ہیں جن کی طرف ذہن بار بار یہ سوال دہراتا ہے کہ ہم کون ہیں، کدھر سے اس زمین میں آ موجود ہوئے۔ شاعر ہمیں بھولی ہوئی داستانیں بھی سناتا ہے۔ ہمیں اس دنیا میں لے کر آتا ہے جس کو ہم روز ہی روز بھولتے جا رہے ہیں۔ اپنی اقدار کو فراموش کر رہے ہیں۔ اپنی زمین کی شادابی کو بربادی میں تبدیل کرتے جا رہے ہیں۔ اس زمین نے ہزاروں سالوں سے انسان کی پرورش کی ہے، اب یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ انسان کو نعمتیں سے نہ نواز سکے۔ پہلے پہل زندگی کا دارومدار زراعت پر ہی تھا۔ اب اس کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں کاٹ کر پکے مکان بناتے جا رہے ہیں۔ پہلی یہ رزق دیتی تھی اب دیارِ غیر سے کما کر لانا پڑتا ہے۔ خالد محمود نے برسوں اس زندگی کو گزرا ہے اس لیے انھوں نے اس احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی ہے جس میں آج کا نوجوان گزار رہا ہے۔ وہاں وہ تنہائی کا شکار ہے۔ اس کو اپنا خاندان اور اپنے لوگ یاد آتے ہیں۔ اسے مٹی کی پکار سنائی دیتی ہے۔ اپنے غم میں سب کی ترجمانی شاعر یوں کرتا ہے:

میں جب سے
دیارِ غیر میں آ کر رہنے
لگا ہوں، تو میں
اپنی مٹی سے کتنا
دور ہو گیا ہوں
میں جب اداس ہوتا ہوں
تو اپنے وطن کی مٹی
کو پوٹلی سے کھول کر
دیکھ لیتا ہوں

(ص،23)

بچپن کے دن یاد
آ گئیں تو پرانے یار بیلی
محلے کے بزرگ، استاد
پرائمری سکول کے ٹاٹ
اور تختیاں بھی
یاد آتی ہیں

(ص،35)

ان کی تمام نظموں میں یہی رنگ نظر آتا ہے۔ ان کی آدھی سے زیادہ نظموں میں یہی یادوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ نئی سائنسی زندگی نے انسان کو جس قدر سہولت دی ہے وہیں یہ اپنی جڑوں کا کھوکھلا کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست اور مکمل ہے کہ انسان کو نئی طرز زندگی اپنانی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی زندگی کو نئے منازل میں داخل کرنا چاہیے مگر یہ کہاں کی منصفی ہے کہ انسان، انسان سے بے گانہ ہو جائے۔ وہ گھروں کے باہر، سارے دن کے کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھک لگا کرتی تھی، جس میں ایک تعمیری سوچ پنہاں تھی۔ اب اسی نئی طرز نے اس کو خود سے

بھی بیگانہ کر دیا ہے۔ مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب میں بھی یہ مسئلہ پوری شدت کے ساتھ ابھرا ہے۔ وہاں تو پہلے ہی روحانیت کا فقدان تھا۔ اس کے لیے وہ مشرق کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ اب یہ دونوں خالی ہیں۔ اس کا احساس خالد محمود کی نظموں میں ہے۔ یہی ان کی تخلیقی سطح ہے جس میں شعوری تبدیلی کو شاعر محسوس کرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم کا عنوان ہے ''انٹرنیٹ''

کتابوں میں پھول رکھنے کا اب
زمانہ نہیں رہا
نہ کوئی کتاب پڑھتا ہے
نہ کوئی پھول بھیجتا ہے
اب تو انٹرنیٹ کا دور ہے
جدید ترین کمپیوٹر کا زمانہ ہے
جدید موبائل کا عہد ہے
اب کتابوں کی جگہ E.MAIL نے لے لی ہے
(ص،40)

ایک دوسری نظم دیکھیے، جس کا عنوان ہے: ''میسیجز''

میں جب بھی موبائل
آن کرتا ہوں
تو سب سے پہلے
تمہارے میسیجز کو دیکھتا ہوں
(ص،42)

اگرچہ اردو میں 'فوٹو' کو مذکر استعمال کیا جاتا ہے، ان کے ہاں اردو گرامر کی غلطی کو درگزر کر دیا جانا چاہیے۔ اس سے بحث خشک ہو جائے گی اور جو آنند ان کی نظموں سے ہم کشید کر رہے ہیں وہ کانوں اور زبان سے جاتا رہے گا۔ دیکھنا یہ مقصود ہے کہ کیا جدید سائنسی چیزیں بھی نظم کا حصہ ہیں۔ ان کی نظم ''یو این او'' کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جس میں جدید لفظ بھی ان کی شاعری کا حصہ بن جاتے ہیں۔ انھوں نے انگلش کے لفظوں کو بڑی مہارت اور معنویت کے ساتھ اپنی نظموں میں کھپایا ہے۔ جس سے یہ الفاظ غیر مانوس اور کھٹکتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ ان سے پہلے ایسے الفاظ ان کے کسی معاصر شاعر کے ہاں نظر نہیں آتے۔ اس سے نظم کا بیانیہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو جدید بیانیے کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس الفاظ سے بننے والی صوت کہیں بھی سماعتوں پر گراں نہیں گزرتی۔ کھپت سے یہ لفظ اردو کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ہماری تہذیب کے لفظ نہیں، پر ان کی اصل تلاش کی جائے تو سنسکرت ہی ان کی ماں قرار پائیگی۔ بہت سارے الفاظ سنسکرت سے انگریزی زبان کا حصہ بنے ہیں۔ زندہ زبانیں ہمیشہ ایک دوسری سے مل کر ہی پروان چڑھتی ہیں۔ یہی ان کی خوب صورتی بھی ہے۔ کوئی بھی جینوئن شاعر اپنے مشرقی سرمائے کو فراموش کر کے نئی چیز تخلیق نہیں کر سکتا۔ اردو شاعری میں مشرقی روایت بہت مضبوط ہے۔ جہاں امیر خسرو (طوطی ہند)،

حضرت میر جی (خدائے سخن)، رفیع سودا، میر درد، آتش و ناسخ، مومن، غالب اور داغ موجود ہوں، اس روایت کی مثال دنیا کے ادب میں کہاں ملے گی۔ جدید شعری ادب میں فیض، میراجی، ن م راشد، پروین شاکر اور عذرا عباس نامور ہیں۔ ان کی ایک نظم 'تحفہ' اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ مشرق کے شعری ادب سے اچھی طرح واقف ہیں بل کہ ان کا مسلسل اور لگاتار مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان شعرا کے دیوان تحفے میں دینا بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ نظم یہ ہے:

میں جب بھی
احمد فراز، پروین شاکر
فیض احمد فیض، غالب اور میر
کے شعر پڑھتا ہوں
تو عجب سرشاری
کے عالم میں چلا جاتا ہوں
ان شعرا کے ہاں
جذبے کی شدت اور جذبات
اپنے ہاں بھی محسوس کرنا لگتا تھا
اسی لیے میں
تمہیں ان کے دیوان
تحفہ میں دیا کرتا تھا

(ص101)

اپنے ہم عصروں شعرا میں خالد محمود اس لحاظ بھی منفرد ہیں کہ ان کے لہجے میں رجائیت ہے۔ امید ہے۔ خبر ہے، یادیں ہیں۔ اور یہ یادیں ان کو نڈھال نہیں کرتیں بل کہ وہ اس سے سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ وہ مستقبل کو حال کے حساب سے نہیں، ماضی کو ماضی بعید سے انسانی لاشعور میں پوشیدہ درخشاں ماضی کے حوالے سے بھی شاداب دیکھتے ہیں۔ بہت ساری یادوں کا تعلق انسان کے حال سے بھی ہے اور ماضی سے بھی۔ وہ نئے آنے والے زمانے کو تابناک سمجھتے ہیں۔ ان کی نظم اندر کی، انسانی لاشعور کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آخر کوئی بھی مشرقی انسان اپنے ماضی سے کٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ جدید شاعری پر ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے۔ جو گل و بلبل سے نکل کر انسان کی بات کرے، اپنی بات کرے۔ ہمارے یہاں سب سے بڑا یہ ہے کہ اس کو سنجیدگی سے دیکھا بھی نہیں جاتا۔ یقیناً خالد محمود، ن م راشد اور فیض سے بڑا شاعر نہیں مگر میں اس حوالے سے ان کو منفرد شاعر سمجھتی ہوں کہ ان کے تجربے ہمارے تمھارے تجربے ہیں، جن کو زبان ملی ہے۔ یہی تجربے ہمارے رگ و پے میں سرایت کرتے ہیں۔ اب نئے آنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ شعری راویت کو کہاں پہنچاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

میری محسن، میری رہبر، میری استاد

یہ 10 اگست 2025 کی رات تھی جب میں دلہن بن کے ہال میں آئی تو میری نظروں نے سب سے پہلے جس چہرے کی تلاش کی وہ میری ایک محسن، میری روحانی ماں، میری رہنما اور میرے لیے دعاؤں کا دروازہ ہے۔ میرے دل کو ہمیشہ اس بات سے اطمینان رہا کہ بھلے وہ میرے کسی فیصلے یا حرکت سے ناخوش ہوں تب بھی وہ میرے لیے دعا گو رہیں گی اور میرے لیے شر میں بھی خیر پیدا ہو جائے گی۔ لوگوں کی نظروں سے نظریں بچا کر جب پورے ہال کا جائزہ لیا تو وہ پُرنور چہرہ دکھائی نہ دیا، دل میں یک دم خیال آیا کہ اللہ خیر کرے ان کی طبیعت ٹھیک ہو۔ اس وقت جب سب کی نظریں مجھ پر تھیں میں نے ہمت کر کے موبائل اٹھایا اور ان کو ویڈیو کال کی۔ ان کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر دل کو اطمینان ہوا کہ الحمدللہ سب خیریت ہے۔ لیکن ساتھ ہی تعجب بھری ایک آواز سنائی دی۔

''ہیں، یہ کیا؟ آج تمھاری بارات ہے۔ تم دلہن بنی ہوئی ہو، بارات تو کل تھی نا''

دراصل شادی کی تاریخ پڑھنے میں ان سے ذرا غلطی ہو گئی تھی۔ یہ رات کے 11 بج گئے تھے ورنہ وہ اپنی بیماری کے باوجود کسی بھی طرح ہال میں آ جاتیں۔ لیکن ولیمے والے دن وہ اپنے پُرنور چہرے پر مسکراہٹ لیے میرے سسرالیوں کے ساتھ ٹیبل پر موجود تھیں۔ ان کو دیکھ کر دل نے سوچا کہ اتنی بیمار حالت میں، جب ان کے لیے بیٹھنا کسی اذیت سے کم نہیں تھا، وہ میرے لیے، میری خوشی میں، میری محبت میں یہاں موجود ہیں۔ محبت بھی کیسی، نہ کوئی خونی رشتہ، نہ کوئی مطلب نہ کوئی غرض، یہ محبت تھی ایک استاد اور شاگرد کی محبت، روح کی روح سے محبت، سب سے افضل سب سے پاکیزہ، بے غرض، بے لوث اور پائیدار۔

آج کے دور میں ایسا کون ہوگا، جس نے اپنے شاگرد سے اس طرح محبت نبھائی ہو، جس نے واقعتاً معلم ہونے کا حق ادا کیا

صبا اسلم

ہو، جس نے حقیقی معنوں میں پتھر کو حقیق بنایا ہو اور جس کی نظریں صحیح معنوں میں سونے کو کندن بنانے کا ہنر جانتی ہو، آج کے دور میں ڈھونڈنے سے بھی ایسے گوہر نہ ملیں، غرض گوہر نایاب:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں،
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

....

یہ ہیں میری محترمہ، نہایت عزیز اور سمجھ لیں کہ میری لاڈلی اور پیاری معلّمہ نصرت نسیم صاحبہ۔ اب تو ماشاءاللہ وہ علم و ادب کے آسمان کا ایک جگمگاتا ستارہ بن چکی ہیں۔ جن کی کتابوں کو کئی انعامات اور میڈلز سے نوازا جا چکا ہے، تو میری کیا بساط کہ میں ان کی تعریف میں کچھ لکھ پاؤں لیکن یہ تحریر میرے جذبات، احساسات اور ان سے تعلق کا مختصر بیان ہے۔

میں ہمیشہ سوچتی ہوں کہ قلم کی نوک سے قرطاس کے سینے پر کچھ بھی رقم کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ پڑھنے والے سمجھ لیتے ہیں، ماضی کے بہت سے قصے تازہ کرنے پڑتے ہیں، کئی بنے ہوئے تانوں کو ادھیڑنا پڑتا ہے۔ لاشعور کو شعور میں لانے کے لیے سالہا سال پیچھے جانا پڑتا ہے، جیسے کہ اب میرا لاشعور، شعور میں آ چکا ہے۔ اب میں موجود ہوں سال 2011 میں، نثار شہید ڈگری کالج کی سالِ دوم کی میڈیکل کی کلاس میں، ایک کم سی، چپ چاپ اور ایک عام سی لڑکی جو کلاس میں کم ہی بولا کرتی تھی۔ اردو کا پیریڈ ہے اور ایک شفیق سی شخصیت، پُرنور اور مسکراتا چہرہ، تقریباً عمر 40 سے 45 سال کے لگ بھگ، نہایت عمدہ لباس زیب تن کیے، ہاتھ میں اردو کی کتاب تھامے، اپنے مخصوص لب و لہجے میں، کلاس کا آغاز ربنا کی دعا سے کرتی ہیں۔ سب یک زبان یک سوئی سے پڑھتے ہیں کہ:

"اے میرے رب میرا سینہ علم کے لیے کھول دے اور میرے لیے میرا کام آسان فرما اور میرے زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات آسانی سے سمجھ سکیں۔"

یہ وہ شخصیت تھیں، جو دل و دماغ کی بنجر زمینوں کی آبیاری کرنا جانتی تھیں، دیے سے دیا جلانا ان کو شیوہ تھا۔ جو کہا کرتی تھیں کہ "کنواں کبھی پیاسے کے پاس نہیں آتا ہے" اور پھر علم کا لبالب پیالہ ایک ایک میں جا جا کر تقسیم کرتی تھیں، جو اعلیٰ کردار بھی تھیں اور اعلیٰ ظرف بھی۔ ان ہی سے ہم نے سیکھا کہ:

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

....

کالج میں کوئی تقریب ہو، کوئی سرگرمی، ہمیشہ پیش پیش رہتیں، تقریبات منعقد کرواتیں، ان کی سربراہی کرتیں، طلبہ کو پہلے تلاشتیں اور پھر قرینے سے تراشتیں، مجھے یاد ہے بارہویں جماعت میں جب میری سہیلی عاصمہ کو تقریر کرنے کا جنون

ہوا، اب مسئلہ تھا تقریر لکھنا، مجھ میں قدرتی طور پر ہلکا پھلکا کچھ لکھ لینے کی صلاحیت موجود ہے، جس کو آج تک میں مستقل طور پر لے کے چلی نہیں۔ میں نے عاصمہ کے لیے تقریر لکھی، تقریر ایسی تھی کہ گویا لفظ لفظ موتی اور پھر عاصمہ کا لب و لہجہ بھی کمال، غرض کالج میں وہ لڑکیاں جو ہمیشہ تقریر میں اوّل آتیں تھیں اس دفعہ عاصمہ ان سب پر بازی لے گئی۔ اگلی بار پھر مقابلہ تقریر ہوا اور عاصمہ کو میں نے پھر تقریر لکھ کے دی۔ اس نے جا کر مس نصرت کو سنائی انھوں نے تقریر سنی اور کہا کہ عاصمہ تقریر بہت اچھی لکھی ہے، اشعار کا استعمال بہت برجستگی اور عمدگی سے ہوا ہے، یہ کس نے لکھی ہے؟ اس دن انہیں علم ہوا کہ کلاس میں جو گم سم اور چپ چاپ سی لڑکی ہے یہ اس نے لکھی ہے۔ انہوں نے مجھے آفس بلوا لیا اور ایک طرح سے پیار بھرا حکم صادر کر دیا کہ تقریر اب تم نے خود کرنی ہے۔ میں کہاں اور تقریر کہاں، ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں۔ کانپتی آواز میں منمناتے ہوئے کہا "میم میں سب کے سامنے نہیں بول سکتی، سوری میں نہیں کر سکتی" مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ سب کے سامنے کچھ بولتی۔ ہاں بس دل کی بات قرطاس کے سینے پر خاموشی سے اتار لیا کرتی تھی، کبھی اشعار کی صورت تو کبھی تقریر۔ مس نصرت نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس دفعہ یہ تقریر تم خود کرو گی، تم بولو گی اور اسٹیج پر جاؤ گی، میں رو پڑی کہ یہ مجھ سے نہیں ہوگا، وہ اٹھیں اور مجھے سینے سے لگا لیا، دلاسہ دیتے ہوئے بولیں کہ تم کر سکتی ہو اور تم ہی کرو گی، نہ جانے ان کے اس پیار میں ایسا کیا تھا کہ اب ان کا حکم ٹالا نہ گیا۔ میں جب بھی کمزور پڑتی یا گھبراتی وہ مجھے سینے سے لگا لیتی۔

میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ جب استاد شاگرد کو سینے سے لگائے تو حوصلوں کو کیسے پرواز ملتی ہے، آج کل ایسے معلم کہاں۔ آج کل تو پیشۂ معلمی بس پیشہ ہی بن کر رہ گیا ہے ورنہ استاد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ انسان کو فرش سے عرش تک پہنچا دیتا ہے اور مس نصرت انہی میں سے ایک ہیں۔

کسی نے کیا خوب لکھا ہے۔

ہماری درس گاہوں میں جو یہ استاد ہوتے ہیں
حقیقت میں یہی تو قوم کی بنیاد ہوتے ہیں

یہی رکھتے ہیں شہرِ علم کی ہر راہ کو روشن
ہمیں منزل پہ پہنچا کے یہ کتنا شاد ہوتے ہیں

اگر روحانیت سے باہمی رشتہ جڑے واصف
تو پھر شاگرد بھی استاد کی اولاد ہوتے ہیں

خیر ان کا پیار ان کا ساتھ اور بار بار سینے سے لگانا مجھے اسٹیج تک لے گیا، میں بولی اور انعام حاصل کیا، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی میری

پشت پر میری استانی کی مستقل دعا، مسلسل کوشش اور ان کا ساتھ ہے۔ میری پیاری، لاڈلی اور بہت عزیز مس نصرت نسیم۔
میں قلم بہت کم اٹھاتی ہوں لیکن جب بھی اٹھاتی ہوں محرک وہی ہوتی ہیں، وہ میرے قلم کو زنگ آلود نہیں ہونے دیتیں انھوں نے مجھے بیٹی کہا اور ماں بن کے میرے ساتھ رہیں، میں ہر کام کے آغاز میں ہمیشہ یہ کہتی ہوں کہ نہیں میں نہیں کر سکتی، مجھ سے نہیں ہوگا وہ ہمیشہ کہتی ہیں کہ تم کر سکتی ہو اور تم کرو گی اور یقین کریں وہ کام میں کر لیتی ہوں اور بہت عمدہ۔
میں کیسے بھول سکتی ہوں، کالج کے گراونڈ میں ان کے ساتھ بیٹھ کے کالج کے میگزین کی پروف ریڈنگ کرنا، ان کے گھر جا کر ان سے گپ شپ اور لکھنے لکھانے کا کام کرنا، پھر وہ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی لذیذ کھیر کھانا، سٹاف روم میں بار بار ان کے پاس جانا اور شعروادب کی بات کرنا، کوئی بھی ایونٹ آئے تو مس کا مجھے اپنے پاس بلانا، یہاں تک کہ کالج کی لڑکیوں نے الوداعی پارٹی میں مجھے "بڑی دیگ کا چمچہ" لقب دے دیا۔
کسی کے قرب نے اتنا وقار تو بخشا
کہ اپنے لہجے سے ہم بے ہنر نہیں لگتے

....

سردیوں کی سنہری دھوپ میں وہ اکثر گراونڈ میں بیٹھ کو مالٹے یا مونگ پھلی کھایا کرتیں، مونگ پھلی کھانے کے بعد لازما قہوہ پیتیں اور کہتیں کہ اس طرح مونگ پھلی کی چکنائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مطلب حساب برابر۔ میٹھا ان کو بے حد پسند ہے۔ کھیر وہ بہت ہی مزے دار بناتیں اور بہت شوق سے کھاتی ہیں، اب بیماریوں کی وجہ سے میٹھا بہت ہی کم کر دیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ کھیر مجھے بھی بہت پسند ہے، اب جب بھی میں ان سے ملنے جاؤں تو وہ کھیر ضرور بنواتی ہیں۔ میں جب بھی ان کے گھر گئی، موسم کے تازہ پھل ہمیشہ جگہ جگہ پڑے ہوئے پائے۔ وہ کھاتی، کھلاتی ہنستی اور چھلکاتی شخصیت ہیں۔ اور ہمیشہ ان کی زبان پر کلمۂ شکر ہوتا ہے۔
میں اظہار میں بہت کمزور ہوں اور وہ سراپا اظہار، سردیوں کی رات تھی، جب میں ان کی کتاب "حرم کی چاندرات" کی پروف ریڈنگ کر رہی تھی، ان کا لکھا لفظ لفظ میرے تصور میں گھوم پھر رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے دل غم سے بھر گیا کہ نہ جانے میں وہاں کی زیارت کر پاؤں گی یا نہیں۔ کوئی سبب کوئی وسیلہ نہ تھا۔ یہ کالج کا ہی زمانہ تھا۔ جب جب ان کی تحریر پڑھتی دل حرمین کی حاضری کے لیے تڑپ تڑپ کے رہ جاتا، ہوا اڑتے ہوئے جہاز کو حسرت سے دیکھتی اور سوچتی کہ ایسا کیسے ممکن ہوگا۔ ان کی تحریر عشقِ رسول سے گندھی ہوتی تھی اور ان کا لکھا لفظ لفظ میرے دل میں اترتا تھا، میں نے نصرت نسیم کو اتنا ساتھ رہ کے نہیں جانا جتنا ان کی تحریر سے جانا۔ یہ ان کی تحریر کی برکت تھی، یا ان کے لفظوں کا اثر، یہ ان کی دعا تھی

یا ان کی مسلسل کوشش، وقت پر لگا کے اڑا، ان کے کہنے پر میں نے بی۔ اے اردو اور پھر ایم۔ اے اردو کیا۔ انہوں نے اچھے سے اچھے اسکول میں میری نوکری کروائی، ان کی کوششوں سے میں پرواز کرتے ہوئے دبئی آئی، اسکول میں اردو کی معلّمہ بنی، واقعی وقت پر لگا کے اڑا اور میں نے خود کو حرمین کی گلیوں میں اڑتا پایا، کعبہ کو دیکھا، چوکھٹ کو تھاما، سبز گنبد کے سائے تلے بیٹھی، احد کی پہاڑی سے باتیں کیں، حرمین کی تراویح پڑھی اور حرم کی چاندرات دیکھی تکبیراتِ حرم کانوں سے جب ٹکرائی تو میں حقیقت سے خیالوں کی دنیا میں جا پہنچی، جہاں میں ان کی کتاب 'حرم کی چاند رات'' کی پروف ریڈنگ کر رہی تھی اور دل دیدارِ حرم کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میری پیاری مس نصرت میں اظہار میں بہت کمزور ہوں میں اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار نہیں کر سکتی لیکن حرم کی بار بار حاضری اور حرمین کی محبت کا محرک بھی آپ ہیں۔ آپ دعا کریں جب تک آخری سانس ہے میں وہاں جاتی رہوں اور وہاں جا کے میرے دماغ میں ''حرم کی چاندرات'' آئے اور میں کعبے کے سامنے بیٹھ کر آپ کے لیے نوافل ادا کروں۔ اللہ آپ کو صحتِ کاملہ و عاجلہ دیں کہ آپ ایک بار پھر وہاں کا دیدار کر سکیں۔

مس نصرت نے زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ دیکھے، ان کی زندگی میں کئی دکھ کئی پریشانیاں آئیں اور میں نے ان کو ہر لمحہ اور ہر قدم پر ثابت قدم دیکھا، کبھی ان کی زبان پر نا شکری یا رب سے شکوہ نہ سنا، بیماریوں نے پے در پے انہیں آ دبوچا، بیماریاں بھی ایسی خطرناک کے پلنگ سے جا لگیں لیکن میں نے کبھی نہ ان کے ایمان میں کمی دیکھی نہ اور نہ کبھی امید کو ٹوٹتے ہوئے پایا۔ ان کا ایمان کامل، کردار مثالی، صاحبِ کتاب، قلم دوست، انتہائی معصوم اور سادہ دل والی، ایک پُرکشش اور باوقار شخصیت ہیں۔ شاید انہیں معلوم ہو یا نہ ہو لیکن میں نے زندگی کے ہر میدان میں ان سے سیکھا ہے۔ کالج سے نکلے ہوئے کئی سال ہو گئے لیکن اب بھی میں ان کی شخصیت سے سیکھتی ہوں، وہ ایک باشعور ماں، ایک باوفا بیوی، ایک باصلاحیت مصنف اور ایک با اثر شخصیت ہیں۔ ان کا ظاہر بھی حسین ہے اور باطن بھی، اور یہ بات حقیقت ہے اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں۔

اس دل میں تیرے حسن کی وہ جلوہ گری ہے
جو دیکھے ہے کہتا ہے کہ شیشے میں پری ہے۔

مختصر یہ کہ میں محبت و عقیدت کی وہ سب کلیاں صفحۂ قرطاس پر بکھیر نہیں سکتی جو میرے دل کے چمن میں آپ کے لیے مہک رہی ہیں۔ میں رابطے میں کمزور ہوں لیکن ہمیشہ اور ہر لمحہ آپ کے لیے دعاگو ہوں، اللہ آپ کو صحتِ کاملہ و عاجلہ دے۔ خوش رہیں، میری استاد، میری محسن۔

☆☆☆☆☆

ردِّ عمل کا شاعر: اکمل حنیف

نوید صادق

اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی اردو ادب اور خاص طور پر شاعری پر گویا یونانی اساطیری میوزز/Muses نامی نو دیویاں بیک وقت مہربان ہونے لگیں۔ قدرت کا نظام دیکھیے کہ پہلے عشرے میں ادھر احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی اور احمد فراز جیسے بڑے چراغِ سخن بجھتے گئے اور اُدھر برقیاتی مواصلات / ٹیلی کمیونیکیشن کے فانوس سوشل میڈیا کہ کہکشاں میں فیس بک وغیرہ کی صورت جگمگانے لگے اور رفتہ رفتہ ان کی چمک تیز تر ہوتی گئی۔ سوشل میڈیا کے معائب سے قطع نظر اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ رسمی ادبی نشستوں کا اہتمام نئے خطوط پر ہونے لگا اور متعدد نئے شعرا جو بڑے شہروں سے دور مضافات میں گم نامی کی زندگی گزارتے تھے، ان کی پہچان کا ایک نیا وسیلہ میسر آ گیا۔ فیض سے معذرت کے ساتھ کچھ یہ صورت بنے گی:

تم آشنا ہو تو ہیں آشنائیاں کیا کیا

....

گویا شعر و نثر کا ایک نقار خانہ تشکیل پانے لگا جس میں نئی آوازوں کو اپنا آپ منوانے کے لیے طوطی سے بلند تر صدائے شناخت لگانی پڑتی ہے۔ ایسی ہی کچھ نئی اور اپنی طرف متوجہ کرنے والی ایک سریلی اور دھیمے سُروں والی لیکن گونج دار آواز اکمل

حنیف نامی جوفِ سخن سے برآمد ہوئی جس کی مقناطیسی کشش سے مفر ناممکن ہے۔
اکمل حنیف نے اپنے اولین مجموعۂ سخن کا نام ''ردِعمل'' رکھ کر قاری کو چونکانے کا اہتمام کر دیا ہے۔ شاعری کس چیز/عمل/عنصر کا ردِعمل ہے، اس کا جواب کتاب کے مشمولات میں قاری کو ایک جگہ تو سیدھے سادے انداز میں اس غزل میں مل جاتا ہے جس کے ردیف کو کتاب کا عنوان بنایا گیا:

جو زمانے نے دیا اکمل مجھے
ہے اسی کا شاعری ردِعمل

....

یہاں شاعر نے بڑی صفائی سے ساحر لدھیانوی کے اس مشہور شعر کے مضمون سے اجتناب کرتے ہوئے خود کو توارد وغیرہ کی غیر ضروری بحث سے بچالیا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

....

کسی شے کو قرض سمجھ کر لوٹانے اور کسی عمل کے ردِعمل میں کیا نمایاں فرق ہوتا ہے اسے سمجھنے کے لیے فلسفیانہ موشگافیوں کی ضرورت نہیں۔ پھر یہ کہ اکمل کے شعر کی ابتدا میں لفظ ''جو'' میں ایک تو مکمل کائنات سی سما گئی ہے اور اس جامع لفظ کی ذو معنویت تجربات و حوادث سے کہیں ماورا جہان کی طرف اشارہ کُن ہے۔
تاہم اس عنوان کو کتاب میں جا بجا بین السطور پڑھنے اور اس کی تفہیم سے لطف اندوز ہونے کے لیے قاری کو بہر طور ناقدانہ محدب عدسے کی عینک لگا کر مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور یہی اس مجموعے کی ادبی قامت کا تعین کرنے کا معیار ہے۔ اکمل حنیف کی شاعری اس کے مشاہدے اور خارجی ماحول کے مابین ایک پراسرار تعامل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے محسوسات کا نام ہے۔ محسوسات کا ایک جہان ہے جس میں عائلی رشتوں کے عصبی ریشے/سوشل فیبرک کو لاحق خطرات کو بچانے اور اس کا احترام سکھانے کی کہیں براہ راست تو کہیں کنائے کے پیرائے میں اظہار ہے:

دیکھتا ہوں جب بھی اکمل پیڑ تپتی دھوپ میں
مجھ کو آتی ہے نظر اس میں شباہت باپ کی

....

یہ ایک مثال ہے جس میں بالکل راست بیانیہ اپناتے ہوئے شفقتِ پدری کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک اور شعر میں دیکھیے اکمل نے کیسے ایک بے رونق غریب طبقے کے سادہ دل بچوں کی نفسیات کا نوحہ قدرے کنائے کا سہارا لے کر ایک المیاتی منظر کا طنز آمیز سماں کس فطری مشاقی سے باندھا ہے:

چھوٹے بچے خوش تھے مہماں دیکھ کر
گھر میں رکھا تھا جنازہ باپ کا

معاشی ناہمواری، کسبِ حلال سے وابستہ کڑی مشکلات اور ان سب کے ساتھ

عزتِ نفس کو مجروح ہونے سے بچاتے ہوئے عام انسان کی جدوجہد کی داستان اور شاخسانوں کو منظوم کرتے ہوئے بہت محتاط اسلوب اپنانا پڑتا ہے کہ احسان دانش اور تنویر سپرا جیسے رجحان ساز شعرا کی چھاپ آپ کے کلام پر پڑنے کا گمان تک نہ ہو کیونکہ ایسا کرنے سے قوی امکان ہوتا ہے کہ ان گھنے اشجار کے سائے میں آپ کی نمو یا تو بہت آہستہ ہو یا آپ ایک الگ شجرِ سخن کے طور پر قاری کو اتنے نمایاں دکھائی ہی نہ دے سکیں۔ اس لحاظ سے اکمل حنیف خوش قسمت ہے کہ لاشعوری طور پر اس نے اپنا منفرد رنگ خوب ابھارا اور متاثر کن اشعار کہے جن میں کارکن طبقے/ ورکرز کلاس کی ذہنیت اور مسائل کو مہارت سے یوں یکجا کیا ہے کہ کسی کی پیروی کی ہلکی سی پرچھائیں بھی دکھائی نہیں دیتی:

کسی کا دھوپ میں چپ چاپ مر جانا
بہت خود دار ہونے کی نشانی ہے

ہوتی نہیں ہے خود سے ملاقات ان دنوں
الجھا ہوں اس قدر میں غمِ روزگار میں

....

پیش کردہ دوسرے شعر میں قریب قریب کلیشے ہوتی ترکیب ''غمِ روزگار'' کو شعر میں نگینے کی طرح جڑ کر ایک ممکنہ احتمال سے گریز کی کامیاب کوشش قابلِ داد ہے۔ اکمل حنیف کی شاعری میں غریب اور محنت کش طبقے کی صرف فریاد ہی مذکور نہیں بلکہ اس کے خلاف خاصا زوردار احتجاج بھی اسی کرب انگیز شعری مملکت کی شہریت کا حامل ہے:

اے امیرِ شہر تیرے گھر کے کوڑے دان پر
بھوکے بچے لڑ رہے ہیں تیرے پھینکے نان پر

خودکشی کرنے پہ مجبور ہوئے لوگ یہاں
مجھ کو اس دیس کے سلطان برے لگتے ہیں

....

فریادی نوحے اور احتجاج کا اگلا مرحلہ تنبیہ اور دھمکانے والا لہجہ ہوتا ہے اور اکمل کے ہاں کئی اشعار میں لہجے کی یہ تلخی گویا کسی ارتقائی عمل کے تحت از خود در آئی ہے:

چمکے گا خون ان کا تری آستین پر
بھوکے جو مر رہے ہیں ترے اقتدار میں

وقت کے سلطان تیرے ظلم پر
دے گی اک دن مفلسی ردِ عمل

....

اب دیکھنا یہ ہوگا کہ معاشی عدم مساوات کا اتنا گہرا مشاہدہ اور اس پر اتنا شدید ردِ عمل کو شاعر کے خارج تک محدود رکھ کر تجزیاتی مطالعے کا حق ادا کرنا ممکن ہے یا مجبوراً شاعر کے باطن کا دریچہ وا کرنا پڑے گا۔ اگر کچھ گہرائی میں جا کر ''ردِعمل'' کی تہہ میں چھپے گہر ہائے سخن تلاشے جائیں تو ان پر پڑی متن کی کائی کے نیچے اکمل کے کرب کی پوری دنیا دیکھنا مشکل نہیں۔ جیسا کہ ابتدائی

سطور میں لکھا، اکمل کو مشرقی خاندانی اکائی کے ٹھوس پن میں پڑتی دراڑوں کا نہ صرف ادراک ہے بلکہ اس خوف ناک رجحان کو منظوم کرنے کی وہ سلیقہ شعاری بھی حاصل ہے جو حساس قاری کو زبردست طریقے سے متوجہ کرنے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے:

گھر کی تقسیم اس طرح ہوئی ہے
صرف رشتے بچا کے بیٹھ گیا

وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں عمر بھر
جو نخلِ خاندان سے دیکھے جھڑے ہوئے

میاں جو ایک گھر کو دو گھروں میں بانٹ دیتی ہے
ہوا ہوں آج میں بھی ایسی اک دیوار سے واقف

جو دوسروں کے حق میں بہت پیش پیش تھا
خود دے سکا نہ بھائی کو حصہ مکان سے

نہیں کوئی جو بوڑھے باپ کے جذبات کو سمجھے
سبھی کو ہے وراثت میں لکھی تحریر سے مطلب

یہ اور اسی قبیل کے کئی اور اشعار ٹوٹتے خاندانوں اور مادیت پرستی کو رشتوں کی حرمت پر فوقیت دینے والی نئی نسل کی ترجیحات میں برپا ہونے والی ہیبت ناک تبدیلیوں کا مرثیہ ہیں جو قاری تک ایک پیغام کی غیر ناصحانہ ترسیل کرتے دکھائی دیتے ہیں اور یہی اندازِ شعر کی رفعت کے لیے بنیادی شرط ہوتا ہے۔ تاہم اس اندوہ ناک فضا کا بیانیہ تشکیل دیتے ہوئے اکمل نے کامل حزن و ملال اور مایوسی کو فروغ دینے کی ہرگز کوشش نہیں کی بلکہ امید افزا فضا کا تانا بانا بھی بنا ہے اور ایسا کرتے ہوئے کہیں خدا تو کہیں خدا کی محبوب ترین ہستی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذکرِ مبارک سے اپنی غزلوں میں عطر بیز پیوند لگائے ہیں:

خود کو تو آلِ نبی کہتا ہے سبحان اللہ
ہم تجھے بس اسی نسبت کے سبب ملتے ہیں

یہ حقیقت ہے ولایت کے مراتب سارے
بس محمد کی اطاعت کے سبب ملتے ہیں

یہ میری آخری خواہش ہے آقا
ترے قدموں میں آنا چاہتا ہوں

....

میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اکمل حنیف کا تخلیقی وفور اس کے اگلے مجموعے میں تنوع کی معراج پانے میں کامیاب ہوگا۔ ہر شاعر کے اسلوب اور مضامین کے مقداری اور معیاری عناصر کا ارتقائی ارتقا ہی اس کے لیے سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔ اکمل کا گہرا سماجی شعور اور اس کا حساسیت سے لبریز خلاقی ذہن ایسے کچھ اور مجموعے ضرور اردو سخن کی ہریالی میں اضافہ کرے گا۔

☆☆☆☆☆

حلقۂ دامِ خیال [سفرنامہ]

اسلام آباد سے شینجن (Schengen) ویزا کیا لگا پروگرام کو گویا پَر لگ گئے ہم نے فوراً ہی برطانیہ یو کے کے لیے درخواست دے دی۔ اب روز انتظار ہے کہ جانے کے پروگرام کو بھی عملی شکل دی جائے اور پھر تو انتظار کی گھڑیاں لمبی معلوم ہونے لگیں جب رحان (بھانجا) کی فیملی بھی یو کے کے لیے روانہ ہو گئی جن کے ساتھ پیرس میں ڈزنی لینڈ دیکھنے کا پروگرام بنا تھا۔ اب سفر سر پر سوار ہو کر باقاعدہ ناچنے لگا مگر ہنگامہ سیرو سفر ہماری خواہش کے مطابق کیسے بن پاتا بلا سے ہماری تمنا سر بھی پیٹ لے۔ یہ کوئی اندرونِ ملک سفر تو نہیں تھا کہ آپ اپنے ٹریول ایجنٹ کو فون کے ذریعہ اطلاع دیں وہ ایئر ٹکٹ بنا کر آپ کو واٹس ایپ کر دے۔ جن کی خاطر ڈزنی لینڈ کا پروگرام بنایا گیا تھا وہ تینوں بچے مل کر بے چین بچے کئی بار اپنے ابو یعنی میرے بیٹے سے پوچھتے، اُن کو بس تسلی ہی دی جا سکتی تھی۔ ایک چٹکلہ میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوڑتا ہے۔ کسی نے عرصہ بعد ملنے والے دوست سے پوچھا۔ بتاؤ بھئی شادی بھی کی یا نہیں دوست نے جواب دیا شادی تو کر لی ہے مگر کی آدھی۔ دوست نے کہا یار یہ آدھی شادی کی بات پلے نہیں پڑ رہی۔ موصوف نے جواباً کہا۔ میں تو راضی ہوں مگر لڑکی والے ابھی رضامند نہیں اور پھر ایک دن جب بیٹے فیصل نے تاکیداً کہا___ آج آپ کہیں اور نہ جائیے گا، برطانیہ ویزا کے لیے جو پاسپورٹ دے کر آئے تھے انھیں لینے جانا ہے تو کچھ اُمید بندھی کہ لڑکی والے بھی شاید مان گئے ہوں متعلقہ آفس سے پاسپورٹ پر ویزا لیے شاداں فرحاں گھر لوٹے تو جانے کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں اور پھر 15 جولائی کو ہم برطانیہ یو کے روانہ ہونے کے لیے لاہور ایئر پورٹ پر تھے۔

اقبال خان یوسف زئی

جہاز میں سوار ہونے سے کچھ دیر پہلے اطلاع ملی کہ ریڈنگ کے جس گھر میں قیام کرنا تھا وہاں کچھ اور مہمان بھی آنے والے ہیں۔ اس پر مجھے خفیف سا غصہ بھی آیا کہ ہم نے اپنے آنے اور ریڈنگ میں سلمان (بھانجا) کے گھر ٹھہرنے کی اطلاع تو بہت پہلے دے دی تھی مگر ___ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ___ سو برمنگھم قیام ٹھہرا ہمیں رحمان کو لندن گاٹ وک (Gat Wick) ایئرپورٹ آنے کے لیے برمنگھم فون کرنا پڑا۔ لندن میں 6- ایئرپورٹ ہیں جن میں ہیتھرو ایئرپورٹ سب سے بڑا ہے ایک اندازے کے مطابق وہاں ہر 40 سیکنڈ بعد ایک طیارہ لینڈ کرتا ہے۔ گاٹ وک ایئرپورٹ پر متعلقہ قانونی کارروائیوں کے بعد باہر نکلے تو رحمان ہمارا منتظر تھا سمان بھی اپنی بیوی بائیک (گھر میں دو گاڑیوں کے باوجود) غالباً بدمزگی رفع کرنے کے لیے ملنے آیا تو خفیف سے غصے کو قابو میں کرنا پڑا۔ اُسے ایئرپورٹ پر گرم جوشی سے الوداع کہہ کر ہم رحمان کی گاڑی میں لدلدا کر برمنگھم کی جانب روانہ ہوئے۔

ایک لمبے سفر کے بعد پھر ایک سفر کی کوفت ___ خیالات کا ریلہ دوبارہ خفیف سے غصہ کے ساتھ جڑ گیا۔ ذہن کو کسی بنا پر مجبور کر دیا جائے تو جانے کہاں کہاں کی خبر لاتا ہے سو ایسا ہی ہوا اور مجھے شاعر قمر جلالوی اور شاعرہ وحیدہ نسیم کے حوالے سے پڑھا ہوا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ وحیدہ نسیم نے ایک تکرار ہونے پر قمر جلالوی سے کہا کہ مشاعرہ میں کسی غزل کو سنتے ہوئے سامعین بہت سے شعروں پر داد دیا کرتے ہیں مزہ تو جب ہے کہ آپ مشاعرہ میں صرف ایک شعر پڑھیں اور داد دیکھیں سو جب مشاعرہ میں قمر جلالوی کو دعوت کلام دی گئی تو سامعین کا قمر جلالوی کے صرف ایک شعر پر داد و تحسین کا وہ شور بلند ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔ اور وہ شعر تھا:

پچھتا رہا ہوں نبض دکھا کر حکیم کو
نسخے میں لکھ دیا ہے وحیدہ نسیم کو

....

سو میرا بھی یہی حال ہوا کہ نسخے میں برمنگھم آیا تھکاوٹ مزید بڑھنے پر کوفت بھی زیادہ ہوئی۔ پاکستان سے یو کے ملازمت کے حامل زیادہ تر افراد اپنی ضرورت کے گھر کرایہ پر حاصل کرتے ہیں۔ وسائل زیادہ ہونے پر گھر خریدا جاتا ہے۔ سمان کا گھر زیادہ بڑا ہے برمنگھم میں صورت حال مختلف تھی کہ وہاں پاکستان سے گئے رحمان فیملی کے 3 افراد پہلے سے موجود تھے سو باقی افراد کے لیے ایک ہوٹل میں انتظام کرنا پڑا۔

اگلی صبح ہم نے یورپ ٹور کے لیے 7- سیٹر ووکس ویگن کرایہ پر حاصل کر لی۔ اب

صبح کا ناشتہ فیصل کی بیوی نایاب اپنی بہن کے گھر میں کراتی اور کھانا لندن کے کسی ریسٹورنٹ میں کھایا جاتا۔ سیر و تفریح کے لیے طے کیا گیا کہ جو لوگ لندن کے قابلِ دید مقامات پہلے دیکھ چکے ہیں وہ نئے مقامات دیکھ لیں۔ رحمان نے ہیمپٹن کورٹ پیلس کی تجویز رکھی سو ہم اُس کی گاڑی میں ہیمپٹن کورٹ پیلس چلے گئے۔

ایک زمانے میں بادشاہت کا ہی زمانہ تھا اور ہماری کہانیاں ''ایک تھا بادشاہ'' سے ہی شروع ہوتی تھیں مگر زمانے کے انداز بدلے تو جمہوریت کے نظام کو ترجیح دی جاتی رہی۔ برصغیر میں ایک مدت تک بادشاہ کا دور دورہ رہا پھر انگریزوں نے ایک مدت تک برِصغیر کو بادشاہت کے زیرِ اثر رکھا بلکہ اتنی بڑی سلطنت قائم کی کہ اُن کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا سو بادشاہ ہی بادشاہ چار دانگ جن کا طوطی بولتا تھا، رہ گئے عوام تو اُن کے نزدیک بادشاہ ہی سب کچھ تھا۔ برصغیر کے ایک حصہ کو تفریق کر دیا گیا پاکستان نام رکھا گیا تو ہماری فیملی کو بھی ہجرت کرنا پڑی۔ میری ماں بے حد سادہ لوح خاتون تھیں باہر نکلنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ ایک مرتبہ وہ انارکلی بازار چلی گئیں وہاں ایک جوتے والی دکان پہ اُنھوں نے کہیں ایک بہت ہی بڑے سائز میں پڑا ہوا ایک نمائشی جوتا دیکھا۔ گھر آ کر اُنھوں نے مجھ سے پوچھا ___ اقبال! انارکلی بازار میں ایک بہت بڑا جوتا میں نے دیکھا_ کیا وہ کسی بادشاہ کا ہے؟ ایک مدت تک اُن کی اس سادہ لوحی کا گھر بھر میں بہت ذکر ہوتا رہا تو جب رحمان نے ہیمپٹن کورٹ پیلس جانے کا پروگرام بنایا تو میں نے سوچا چلو بادشاہ کا محل دیکھیں گے، بادشاہ کا جوتا تو پرانی بات ہوگئی۔ عام آدمی کا اندر سے محل دیکھنا بادشاہ کی زندگی میں تو یہ ناممکن تھا مگر اب تو خاص و عام سب کو ہی اجازت تھی۔ سو محل تو اتنے بڑے رقبے میں بنا ہوا ہے اور ایسی نادر اشیاء سے بھرا ہوا ہے کہ آدمی دیکھتا رہے حیرت زدہ ہو کر سنبھلتا رہے پھر دوبارہ حیرت میں جانے کے لیے محل کی اتنی خوبصورت تعمیر کا دیکھنا بذاتِ خود یادگار بنتا جائے گا۔ اس قدر نفاست کے ساتھ نقش و نگار کو اس قدر حسین بنانا انسانی ہاتھوں کا کارنامہ جانتے ہوئے بھی دل نہیں مانتا۔ پتھروں کو موم کی طرح ڈھالنا، موڑنا، بنانا، سنوارنا، سجانا ایک ایک ڈیزائن کو اس قدر دلکش بنانا انسانی فہم کی کاریگری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

آج کے دورِ جدید میں تو جب اس طرح کے ڈیزائن بنانے میں مشینوں سے مدد لی جاسکتی ہے ہنری ہشتم کے زمانے میں پانچ

صدی پہلے اتنی نفاست کے ساتھ اُن لوگوں نے ناممکن کو ممکن بنایا محل کے بہت سے ہال ہیں اُن میں گریٹ ہال کی اپنی ایک اہمیت ہے بارہ سنگھوں کے سروں کے ساتھ سجایا گیا یہ ہال اُس کی چھت کی نقاشی میں لکڑی کا استعمال کمالِ فن کا منہ بولتا شاہکار ہے محراب دار دروازے اور لمبی محراب کی کھڑکیاں جن میں اعلیٰ قسم کے بہت سے رنگوں کا شیشہ استعمال کیا گیا ہے اور دیواروں کو بڑے کینوس کی پینٹنگز سے سجایا گیا ہے۔ مختلف جگہ پر آویزاں اُس دور کی پینٹنگز کو اتنی خوبصورتی اور مہارت سے بنایا گیا ہے جیسے وہ تصویریں ابھی زندہ ہو کر ہمارے سامنے آ جائیں گی۔ ہنری ہشتم کے کچن میں سجائے گئے کھانے پینے کے برتن کھانے پینے کا سامان مجسم شکل میں رکھا ہوا ہے حالانکہ سامان ڈھونے کے لیے ہاتھ سے کھینچنے والی ریڑھیوں تک ترتیب اور سلیقے کے ساتھ اپنے زمانے کی اپنی تاریخ بیان کرتے ہوئے سامان کا رکھنا بذاتِ خود ایک فن ہے جس کا اظہار ہر جگہ موجود ہے لمبی لمبی سیڑھیوں کی ریلنگ کو آدمی محویت کے ساتھ دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے پتھر کی الماریاں بنانے میں جو مہارت نظر آتی ہے دل چاہتا ہے کاش میں اُن کے زمانے میں ہوتا تو کاریگروں کی اُنگلیاں چوم لیتا۔

محل کے اطراف میں ایکڑوں میں پھیلے ہوئے باغات ــــ میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا۔ وہاں چمن کی تزئین و آرائش اور انتظام قابلِ تحسین تھا یوں لگتا تھا کہ ایک ایک پھول یا زیادہ سہولت کے ساتھ کہہ لیں کہ ایک ایک پتی کی حفاظت صفائی ترتیب کا وہ حُسنِ انتظام کہ آدمی خدا کی صناعی کا قائل ہو کر اُن کی آرائش کرنے والوں کی صلاحیت اور عظمت کا بھی قائل ہو جائے ہر قطعہ خوبصورتی کی تاریخ بیان کرتا ہوا۔ پھولوں کلیوں سے بھرے ایسے ہی ایک قطعہ کی طرف قدم خود بخود بڑھتے چلے گئے محل کی ایک بیرونی دیوار پر جہاں سنگی مجسمے اپنی داستاں سناتے ہیں چار پانچ گھوڑے برابر برابر بھاگیں اتنی چوڑی راہ گزر اور دور پانی برساتا ہوا ایک فوارہ بُراق پھوار کے ساتھ اپنی طرف بُلاتا ہوا تین سیڑھیاں اُتر کر ہم اُس کی طرف لپکے ہمارے قدموں تلے سنگریزوں سے بھرا رستہ تھا اور دونوں اطراف سبزے کی مخملیں فرش ایک سیمیں بدن مجسمہ اُس کے اردگرد بطخوں کی ڈار فوارے کی طرف بڑھتی ہوئی۔ خوشبو کی مہک دل کی گہرائیوں اور قوتِ شامہ کی پہنائیوں تک اُترتی چلی جاتی ہے ذہن کے دور اُفتادہ گوشوں میں ملکوتی سا جلترنگ بجنے لگا جیسے چاندنی کرنیں ملا کر کوئی کلی کھل کھلا کر ہنسے

لگے پھول بن جائے باتیں کرنے لگے اور پھر یہ منظر آپ کے ذوق وشوق کو مہمیز دیتا ہوا آپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ہوا میں جھونکے خوشبو کا بدن اوڑھ کر روح کی بالیدگی کو اس قدر بڑھا دیں کہ یہ کہنا بھی کم لگے کہ:

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر

ہیمپٹن کورٹ پیلس کی حدود میں باغات کی جگہ سے باہر نکل کر کیا دیکھتے ہیں ایک بگھی کھڑی ہے ہم بگھی میں بیٹھ گئے تاکہ سیر کا مزید لطف اُٹھایا جاسکے۔ بگھی میں جتے ہوئے دو توانا اور مضبوط گھوڑے دُلکی چال چلتے ہوئے دریا کے کنارے کنارے اپنے جانے پہچانے مخصوص راستے سے گزرتے ہوئے ہمیں پھر وہیں اتارتے ہیں جہاں ہم بگھی میں سوار ہوئے تھے سفر ختم ہو جاتا ہے مگر یاد آپ کے ساتھ سفر کرتی ہے۔

21 جولائی کو ہماری فیملی کے ڈاکٹر فیصل جو حال ہی میں پاکستان سے برطانیہ برمنگھم کے ہسپتال میں یورالوجسٹ کے طور پر تعینات ہوئے ہیں انھوں نے ٹن میرن ایبے (Tintern Abbey) دیکھنے کا پروگرام بنایا تو لندن کے بعد ایک نئی جگہ جانا اور ایک تاریخی عمارت کو دیکھنا کچھ ایسا دل کو بھایا جیسے یہ پروگرام ہم نے ہی ترتیب دیا ہو دیکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا مزید ایک گاڑی کا انتظام کیا گیا اور یوں تین گاڑیوں میں ہماری سیاحت شروع ہوئی۔ ویلز کی اس تاریخی عمارت نے جو میرے ذہن پہ پہلا تاثر چھوڑا وہ تو یہی تھا کہ ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت تھی شاندار'' اُس معبد گاہ کے ایک خاصے بڑے حصے پر چٹانی اینٹوں کا ایک ڈھیر نظر آیا گو وہ تمام چٹانی اینٹیں انگریزوں کے نظم وضبط اور سلیقے کی آئینہ دار تھیں یعنی ترتیب سے رکھی ہوئی پھر ایک جانب نگاہ کی تو پہلی والی حالت میں لانے کے لیے تعمیری سرگرمیاں بھی جاری تھیں تو میں نے دل میں سوچا کاش ہم بعد میں آتے تو زیادہ اچھا تھا۔

آج کے زمانے میں کسی تاریخ عمارت کا جس زمانے میں وہ تعمیر ہوئی یعنی جب اُسے بنے سینکڑوں سال گزر چکے ہیں، کا دیکھنا میرے دل میں ایک تلاطم سا بپا کرتا ہے میں خود کو اُس زمانے کا حصہ بن کر اُس وقت میں داخل ہوتا ہوں جب تعمیر مکمل ہونے کے بعد جیسے میں اُس دیکھ رہا ہوں ٹن میرن ایبے جس کی ظاہری حالت کو سنوارنے کا عمل بھی جاری تھا تو میں نے سوچا اِس عبادت گاہ کو زمانے کے کتنے نشیب وفراز نے اسے کتنے اور کہاں کہاں زخم لگائے اب یہ سب کچھ میری نظروں کے سامنے ایک زندہ حقیقت کی طرح کھڑا تھا۔

میں اپنے خیال کے مطابق ایسی کسی بھی

عمارت کی شکستگی کو نظر انداز کر کے اُس کی تعمیری شکل کو سامنے لاتا ہوں گویا یہ مسمار نظر آنے والا حصہ نہیں بل کہ مکمل تعمیر کے بعد یہ اُس کی دیوار ہے در ہے محراب ہے ستون ہے۔ میں اپنے ذہن میں فرض کر لیتا ہوں اس جگہ پر یہ ستون صحیح سالم کھڑا ہے اپنی پوری مضبوطی کے ساتھ اپنی پوری قامت کے ساتھ بعض اوقات میں اپنے خیال کو جھٹک کر پھر اُس سپاٹ جگہ کو دیکھتا ہوں مگر اس طرح کی عمارت دیکھ کر اس طرح سے دیکھنا اور سوچنا میری عادت بن چکا ہے۔

1131ء میں یہ شاہکار گوتھک آرکیٹیکچر کی عبادت گاہ معرضِ وجود میں آئی تھی پھر بارھویں اور تیرھویں صدی میں دوبارہ تعمیری مراحل سے گزری گو اب اُس کا کافی حصہ شکستہ ہو کر گر پڑا ہے اس کے باوجود باقی ماندہ عمارت کا حسن دیکھنے اور تعریف کرنے کے قابل ہے تعمیری معجزہ دیکھنے کے لیے وہ چٹانی اینٹوں کا ڈھیر پھر اپنے اپنے مقام پر پہنچنے کے لیے ہنر مند ہاتھوں کا منتظر ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں دنیا میں جتنے مذاہب ہیں یہودیت ہے عیسائیت ہے اسلام ہے آتش پرستوں کی عبادت گاہ ہے بدھ مت ہندو مت ہے اُن کے معبد خانے نے بے حد شاندار تاثر کن تعمیر کے حامل نظر آتے ہیں اُن مذاہب کی شاندار روایت کے عبادت خانوں کے رکھوالے بھی بہتر سے بہتر حال میں شان و شوکت کے ساتھ احترام کی تمام تر جزئیات کے ساتھ نہایت متاثر کن زندگی گزارتے ہیں خواہ اُن کے ماننے والوں کا حال کیسا ہی خراب کیوں نہ ہو۔

برمنگھم سے اگلی صبح پھر لندن کی سڑکوں پر قابلِ دید مقامات ونڈسر کیسل ۔ بکنگھم پیلس۔ بگ بین کو دوبارہ اس طرح دیکھا جیسے پہلی دفعہ دیکھا ہو آکسفورڈ یونیورسٹی بھی دوبارہ دیکھنے کی خواہش تھی مگر اُسے اتنے کم وقت میں دیکھنا ممکن نہ تھا البتہ لندن کی سڑکوں کے کنارے جتنی عمارات ہیں سینکڑوں برس پرانی مگر مضبوط دلکش نقش و نگار کی حامل ایسی شاندار کہ آدمی ٹھہر کر دیکھنے پر مجبور ہو جائے اُنھیں سرسری طور پر دیکھنے میں بھی دن ڈوب گیا اور ابھی ہمیں برمنگھم واپس جانا تھا اڑھائی گھنٹے کی مسافت طے کر کے برمنگھم سے اب ہمارا سفر 7 میٹرو وکس ویگن کار اور رحمان کی بی ایم ڈبلیو کے ساتھ پیرس کے لیے ایک مقام ڈوور (Dover) پر سڑک ختم ہو جاتی ہے اور ہم نے چیکنگ پوسٹ کی قانونی کارروائی کے بعد فرانس کے پیرس شہر میں داخل ہونا ہے 4 لمبی قطاریں گاڑیوں کی ہیں۔ ہم اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے چیکنگ ونڈو پر اپنے پاسپورٹ چیک کراتے ہیں یہ

تمام عمل 30 منٹ میں مکمل ہو جاتا ہے اور ہم بحراوقیانوس (Atiantic) کے سمندر پر کھڑی بہت بڑی فیری میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اندر داخل ہوتے ہیں یہ فیری اتنی بڑی ہے کہ اس کے چار ڈیک تو محض گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے مخصوص ہیں۔ فیری میں کئی لفٹس ہیں ہم ایک لفٹ سے اوپر کی منزل میں پہنچے اسقدر وسیع ہال جیسے زمین پر کسی بڑے ہوٹل کا وسیع ہال ہو۔ قرینے اور سلیقے سے سجی میزیں اور کرسیاں سروس کے لیے مستعد مودب عملہ - بیٹا میرے اور اپنی فیملی اور رحمان کی فیملی کے لیے قطار میں کھڑے ہو کر کھانے پینے کا سامان خرید کر لایا۔ ہم سب وہاں بیٹھ گئے ونڈو کے قریب جہاں سے سمندر کا نظارہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ فیصل بیٹے کے تینوں بچے بے حد خوش نظر آ رہے تھے یہ اُن کا پہلا سمندری سفر بھی تھا۔ فیری سے باہر بارش کا منظر ایک عجیب سا تاثر پیدا کر رہا تھا۔ پانی پر تیرتی ہوئی فیری، آسمان سے برستا ہوا پانی۔ جوانی میں بارش برسنے پر گھر سے لارنس گارڈن بھیگتے ہوئے جانا کبھی تنہا کبھی ایک دو دوست پہاڑی کے دامن میں وہاں کے اکلوتے کیفے میں چائے کے کپ سے اُٹھتی ہوئی بھاپ کا ملگجا سا دھواں، وہ دوست کی یونہی سی بات پر یونہی سا ہنستا قہقہے لگانا۔ میں پھر خود ہی چونک کر اپنے بیٹے کے بچوں کو دیکھنے لگا اُن کی معصومانہ باتوں پر ہنسنے لگا۔ مگر اُس ہنسنے میں اور اس ہنسنے میں کتنا فرق ہے۔ پھر میں نے سوچا۔ ماضی کو سوچنا موجود خوشی کو نم آلودنہ کر دے۔ پھر سوچا پچھلے سال نیو یارک میں مجسمۂ آزادی دیکھنے کا سفر فیری میں ہی تو کیا تھا مگر یہ فیری تو اُس سے کہیں زیادہ بڑی ہے اس فیری میں سفر کرنا زندگی کا پہلا تجربہ ہے کہ جس میں ہماری دو کاریں بھی سفر کر رہی ہیں چاروں ڈیک میں پارک کی ہوئی گاڑیوں کے ساتھ، ملکوں ملکوں سے آئے ہوئے لوگ ہمارے ہم سفر ہیں۔ میں اُن کے خوش و خرم چمکتے دمکتے شاداب چہروں میں اپنے ملک کے افسردہ ماتھے پر تفکر کی سلوٹیں لیے چہرے دیکھتا رہا۔ نوے منٹ کے سفر کے بعد فرانس کی سرحد کیلس (Calais) میں داخل ہوتے ہیں اور پیرس پہنچتے ہیں پیرس ___ نئے نئے فیشن کے حوالے سے اپنی انفرادیت بنانے والا شہر__ روشنیوں کا شہر ایفل ٹاور کے حوالے سے دنیا جسے جانتی ہے۔ امریکہ کے ڈزنی لینڈ کی انفرادیت کے بعد پیرس کا ڈزنی لینڈ مگر ہم کیلس سے پیرس اُس وقت پہنچے جب کھانا کھانے اور پھر سونے کا وقت ہو چکا تھا۔ گوگل کی مدد سے جائے طعام پر پہنچے جہاں حلال کھانا دستیاب تھا اور جہاں

بہت زیادہ قیمت وصول کر کے ریسٹورنٹ والوں نے حلال کھانے والوں کو دونوں طرح حلال کیا جیسے بہ زبان پنجابی کہہ رہے ہوں کہ ــ ہور چوپو ــ یا شاید ہم ہی ادا شدہ یورو کو پاکستانی کرنسی سے ضرب دے کر اُن کی خوش قسمتی پر رشک کرتے رہے۔

پہلے سے 4 کمروں کا ایک گھر بک کرا لیا گیا تھا مکمل کچن ٹی وی لاؤنج موجود تھا۔ ایک کمرہ میرے حصے میں آیا رات بھر مجھے تھکن بے خبر سلاتی رہی۔ صبح پروگرام کے مطابق ورسیلز محل دیکھنا تھا گوگل سے مقام کا تو علم ہو گیا مگر یہ جان کر حیرت ہوئی تمام ٹکٹیں آج کے دن کی فروخت ہو چکی ہیں۔

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور ـ

ہم نے سوچا نوترے ڈیم کیتھڈرل چرچ دیکھ آتے ہیں۔ گوتھک آرکیٹیکچر کی یہ شاہکار کیتھولک عبادت گاہ 1153ء میں تعمیر ہوئی تھی 1840 میں اس کا زیادہ حصہ دوبارہ بنایا گیا۔ پھر 2019 میں آگ لگنے کا واقعہ ہوا۔ سوا کیسویں صدی کے تعمیراتی سامان کے ساتھ اس کی تزئین و آرائش کی گئی ہنچ بیک آف نوترے ڈیم کے نام سے ایک فلم بھی بنی جس سے چرچ کی شہرت مزید دلوں تک پہنچی نوترے ڈیم چرچ کو دیکھنے والوں کی ایک لمبی قطار ہے جہاں چرچ کے اختتامی وقت تک قطار بننے کا عمل جاری رہتا ہے شہرت بلاوجہ نہیں ہوتی بے شک اُس کا تعمیراتی حسن دیکھنے کے قابل ہے۔

نوترے ڈیم چرچ دیکھ کر کار پارکنگ کی طرف جا رہے تھے راستہ خاصا دور تھا۔ میں گھٹنے کی تکلیف کے سبب زیادہ پیدل چل نہیں سکتا وہیل چیئر کا استعمال کرتا ہوں بیٹا فیصل وہیل چیئر چلا رہا تھا اُس کی ایک چھوٹی بیٹی زارا میرے گھٹنے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ فٹ پاتھ ایک جگہ قدرے ناہموار تھا۔ بیٹا لڑکھڑایا وہیل چیئر اُلٹ گئی اور یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا۔ مجھے بس یہ یاد ہے کہ زارا کو سنبھالنا ہے۔ خدا کا شکر کہ ہم دونوں کو کسی قسم کی چوٹ نہیں لگی البتہ بیٹے کو ٹانگ پر تین چار خراشیں آئیں۔ فٹ پاتھ پر کس کس کا ہاتھ تھا جو ہمیں سنبھالنے کے لیے نہ بڑھا ہو، ہمارا حال نہ پوچھا ہو۔ سڑک پر قریبی گاڑیاں تک رُک گئیں یہ احترام بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ کون سا سٹور، شاپنگ پلازہ یا ریسٹورنٹ ہے جہاں مجھ سے پہلے پہنچنے والے نے خواہ کوئی عورت ہے کوئی لڑکی ہے یا کوئی مرد جس نے میرے اندر داخل ہونے کے لیے بیرونی دروازہ تھامے نہ کھڑا ہوا ہو یہ اخلاقیات سب کے لیے اُن کی تربیت کا گویا حصہ ہیں۔

[جاری ہے۔]

”غم ورثہ ہے“ [ناولٹ] (بقیہ حصہ)

دردانہ نوشین خان

ثمینہ کو اُس کے کمرے میں دھکیل کر جو واپس بیٹوں کی طرف چلی گئی ثمینہ دس منٹ سکتے کے عالم میں پڑی رہی۔ پھر اُٹھی کوئی بیگ کھینچا کپڑے ٹھونسے۔ سونے کی دو انگوٹھیاں اور بالیاں اور کچھ پیسے ڈالے۔ مُنہ دھو کر نکلی اب شامہ کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ بجو ماسی کے کمرے کی طرف دیکھتی رہی۔ کیا میں اندر جاؤں، نہیں اب نہیں، ثمینہ نے گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھ دیا۔
تین راستے تھے۔ اندھی کھوئی میں چھلانگ لگا دے...... پڑوسن ریحانہ باجی کے گھر رات گزارے...... بس سٹاپ پر والدین کے گھر جانے والی بس میں بیٹھ جائے......
یہ ضروری نہ تھا کہ بس مل جائے...... اندھا کنواں دُور تھا...... چھلانگ لگا کے بھی نہ مری تو...... وہ ریحانہ باجی کے گھر چلی گئی۔
ریحانہ نے کہا تھا میں تمھارے گھر کا فون ملا دیتی ہوں، مگر...... سچ تو یہ تھا کہ آج جتنی نفرت اُسے مجید سے تھی اُتنی ہی بیزاری والدین سے تھی۔
اُس نے بات کو جھوٹ بول کر سنبھال لیا۔ والدین کے گھر تالہ ہے وہ لاہور گئے ہیں صُبح وہ چلی جائے گی۔
”پگلی...... شرمندہ نہ کرو۔ رات رہنے سے مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔“

ریحانہ کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے بولی مگر ثمینہ نے کہاں کھانا تھا وہ سارا وقت بولے گئی۔ ''ریحانہ باجی...... میری شامہ صبر والی بچی ہے۔ سہم جاتی ہے، زور سے کچھ کرے تو آواز سے ڈر جاتی ہے۔ وہ ضد نہیں کرتی، منع کر دو تو رُک جاتی ہے۔ باپ کی تو آواز پر دبک جاتی ہے، جو مل جائے کھا لیتی ہے۔ اُسے جھاڑو لگانا آتا ہے۔ وہ امامہ کو بہت یاد کرتی ہے...... ایک دن سکول میں بھوکی گئی اُستانی نے اُسے ایک ٹافی دی تھی...... وہ اُس کا ریپر بستے میں لے آئی تھی مجھے کہا یہ ٹافی مزے کی تھی۔ امامہ نے بھی ایک بار کھائی تھی۔ مجھے یہ ٹافیاں لے دو...... میں تو اُسے وہ ٹافیاں بھی لے کر نہیں دے سکی......

ثمینہ کبھی روتی کبھی بولتی رہی اور رات گزر گئی۔

صبح روشنی ہوتے ہی وہ یہ کہہ کر خدا حافظ کر گئی۔

''ریحانہ باجی...... تمھارا بڑا احسان ہے۔ میری شامہ کو دیکھتی رہنا۔ کبھی کبھی اُسے پیار کر لینا اور کہنا یہ تمھاری امّی نے چپی کی ہے...... یہ پیسے رکھ لو اُسے ٹافیاں لے دینا۔''

ریحانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے پیسے واپس کرتے ہوئے وعدہ کیا وہ شامہ کو ٹافیاں لے دے گی۔

گھر سے باہر نکل کر وہ خالی الذہن 'اپنے' گھر کو دیکھتی رہی۔ سردی کے ساڑھے چھ بجے کون باہر نکلتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ چلنے لگی کرب اتنا تھا کہ دل میں سماتا نہ تھا۔

وہ ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر چھٹی کی درخواست دینے کیوں جا رہی تھی اُسے خود معلوم نہ تھا مگر اس میں مصلحت یہ ہوئی کہ چوکیدار نے اُسے پارسل لا دیا ثانیہ نے موبائل بھیجا تھا۔ چوکیدار نے ہی اس میں سم ڈال کر چارجنگ لگا دی جب تک وہ درخواست کے لیے بیٹھی رہی۔

وہ ویگن سٹینڈ پر آ گئی۔ اُس کے والدین کے شہر جانے والی ویگن تیار ہو رہی تھی۔ وہ جا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد شہریار جو یہ ویگن میں سوار ہوا وہ تحصیل عدالت جاتا رہتا تھا۔ صبح سویرے تن تنہا ثمینہ کو دیکھ کر اُس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی...... وہ رُک کر اُسے دیکھتا...... اس کی آنکھیں بہت روئی ہوئی لگ رہی ہیں۔ اس کی بچی بھی ساتھ نہیں۔ اُداسی، تھکن، بیزاری، مایوسی...... آخر کیا بات ہو گی۔ ثمینہ نے موبائل نکالا...... اُس کے لکھنے میں اناڑی پن تھا۔ ثمینہ نے ثانیہ کو میسج کیا۔

''موبائل بھی تب آیا جب اس کی ضرورت نہ رہی۔ مجید نے طلاق دے کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس وقت ویگن میں ہوں مگر ملک نذر محمد صاحب کے گھر نہیں جا رہی۔ اللہ کوئی محفوظ مقام دے دے گا۔ نہیں دے گا تو یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہوگا۔ کال نہ کرنا۔ ایک واقف بندہ بیٹھا ہے میسج کرتی رہنا۔

فکرمند ہوتی رہنا۔ جواب یہی ہے جو دے چکی۔''
ثمینہ نے موبائل پرس میں ڈالا۔ کنکھیوں سے جویریہ کو دیکھا۔
کاش میں اسے تلقین کر سکتی تم میری بیٹی کا خیال کرتے رہنا جویریہ نے اُسے دیکھتے پاکر اپنا کارڈ نکالا ثمینہ کو بڑھاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔
''رکھ لیجیے۔ پلیز ...... ضرورت پڑ سکتی ہے۔''
ثمینہ نے کارڈ لے کر رکھ لیا۔
ویگن سے اُتر کر وہ ثانیہ کے میسج دیکھنے لگی۔
''امّی کے گھر جاؤ۔ خدا کے لیے کوئی حماقت نہ کرنا''
اُس نے رکشہ روکا اپنے شہر کے دارالامان کا بورڈ ایک آدھ بار دیکھنے کے باوجود یاد تھا۔
معلوم نہیں وہ امان کا گھر تھا یا نہیں وہ آچکی تھی۔ گیٹ کے نزدیکی چھوٹے کمرے سے خشخشی ڈاڑھی والا نمودار ہوا۔
''کدھر بی بی؟''
''وارڈن صاحب سے ملنا ہے'' جوان عورت، بیگ، اُجڑی صورت کہانی تو پرانی لگتی ہے
''کہاں سے آئی ہو؟''
''کیا تمام سوالوں کا جواب تمھیں دینا ہے۔'' کھردرا بولنا تو وہ سیکھ چکی تھی ابھی کچھ کہتا کہ گیٹ کے باہر کسی گاڑی کا ہارن بجا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا گاڑی سے کوئی بیگم صاحبہ نما خاتون برآمد ہوئی۔ وہ میڈم چوہان کا پوچھ کر اُسے بھی 'چلو میرے ساتھ' کہہ کر لیتی گئی۔
ثمینہ نے بیگ اُٹھایا چلتے ہوئے اُس سے پوچھا
''کیا نام ہے تمھارا؟''
''باپ یا خاوند کا نام؟ میرا مطلب تمھارا پورا نام؟''
''میں پوری صرف ثمینہ ہوں'' وہ مسکرا پڑی
''اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز نہیں تو اسے یہاں رکھ دو۔ کہیں نہیں جاتا'' ثمینہ نے بیگ برآمدے میں رکھ دیا۔ قیمتی چیزیں اُس کے پرس میں تھیں۔
میڈم چوہان پلنگ پر لیٹی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر غریب لباس عورت اُس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ میز پر چائے کے خالی برتن رکھے تھے۔ بیگم صاحب کو دیکھ کر وہ گرمجوشی سے اُٹھی۔ غریب لباس عورت نے جھٹ سے گاؤ تکیہ سرکا کر اس کی پشت سے لگا دیا۔ اُن کے درمیان کچھ یوں گفتگو ہونے لگی۔
''آؤ حنا...... بیٹھو...... مجھے آپ کا مسئلہ بالکل یاد ہے۔ فلائٹ تو ہفتے بعد ہے نا آپ کی؟'' پھر ثمینہ پر نگاہ پڑی 'یہ کون ہے؟''
''یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ کون ہے۔ اعظم اسے روک رہا تھا۔''
''اعظم تو پورا افسر بنتا ہے۔ جو بھی آئی وہ قریشی کے پاس بھیجے فارم اندراج کرے...... بی بی! تم کون ہو؟ پولیس کیس تو نہیں ہو؟ سچ اور مختصر بتاؤ۔''
ثمینہ نے سچ بتا دیا۔ ''خاوند نے تو نکال دیا

والدین کہاں ہیں تمہارے" اُس نے پوچھا۔ دریں اثنا ثمینہ کی کہانی پہ توجہ کرتی غریب لباس عورت کے ہاتھ کی کندھا دباتے ہوئے حرکت کم پڑنے لگی تو میڈم چوہان اُسے ڈانٹ کر بولی

"اری مردود...... ترے ہاتھوں سے جان کیوں نکلنے لگی" پھر وہ حنا بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوئی۔

"آج وزٹ تھی - میں نے اتنی لمبی پریزنٹیشن وی کھڑے ٹانگیں تھک گئی۔ اُدھر چینل والے کیمرے لے ہر جگہ کی ویڈیو بنا رہے تھے...... پھر ہنرمند عورتوں کو سرٹیفکیٹ تقسیم کیے - سلائی مشین اور امداد لفافے بانٹے...... پھر کہیں چائے پی کر گئے...... چائے سے یاد آیا چائے تو پئیں گی ناں آپ...... ہاجرہ...... تازہ چائے لے آؤ۔

حنا جی نے چائے سے معذرت کر دی......

میرا پرابلم حل ہو تو تسلی ہو" اُس کے یہ کہنے پہ میڈم کو ثمینہ سے کیے گئے سوال کے جواب کا خیال آیا

"والدین؟"

"سلامت نہیں ہیں" وہ جواب سوچ چکی تھی۔

"بیٹے کس کے پاس رہتے ہیں"

"ماموں کی سرپرستی میں" پھر ثمینہ نے اپنی تعلیم ،ہیلتھ ڈپلومہ کا بتایا۔ "اچھی پڑھی لکھی باشعور لگتی ہے حنا...... تمہارے مطلب کی ہے" ثمینہ چونک سی گئی مگر الرٹ رہی۔ حنا جی نے اب ثمینہ کی طرف توجہ بڑھا دی۔ پہلے تو کھانا منگوایا۔ ہاجرہ لنگر کا کھانا لائی۔ آلو چکن شوربہ اور روٹیاں۔ حنا اُسے محبت سے کھانا کھانے پر آمادہ کرتی رہی - وہ بھی کل سے بھوکی تھی۔ کھانے کے دوران سوچتی رہی اماں ابا کو لوٹ، چلوں (نہیں بہت آزمالیا) شامہ کیسی ہو گی کیا میں اُسے قانوناً لینے کی بات کروں (اچھا دیکھتی ہوں)۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر واپس آئی تو حنا جی نے سوال کیا۔

"ثمینہ! تم نے حتمی فیصلہ کرلیا ہے کہ زندگی کوئی نیا راستہ تلاش کرنا ہے"

"بچوں کی یاد نہیں آئے گی بیٹے کتنے بڑے ہیں؟"

"میری ریکوسٹ ہے کہ میری ذاتی زندگی کے متعلق مزید سوالات کے بجائے آپ مجھے یہاں رکھنے یا نہ رکھنے سے آگاہ کریں۔ یہاں رہی تو سوالات کے جوابات دیتی رہوں گی۔"

میڈم چوہان نے کہا

"اب میری بات توجہ سے سنو - دارالامان میں رہنا ہے تو قریشی کلرک فارم پُر کروائے گا شناختی کارڈ کی کاپی اور فوٹو دینا ہوگا۔ دوسری صورت یہ حنا فلک آفریدی ہیں۔ یہ کالج میں میری جونیئر اور دوست تھی۔ اسے ذاتی طور پر جانتی ہوں۔ اس کا شناختی دیکھ لو، کاپی لے لو، یہ اب ابوظہبی میں رہتی ہے۔ اس کا خاوند کروڑ پتی بزنس مین ہے۔ بیٹا

بیٹیاں ہیں۔ تم ہم پر شک کر سکتی ہو۔ ہم تم پر شک کر سکتے ہیں۔ مگر بھروسہ تو کرنا پڑے گا۔ جنا کو سمجھدار مناسب عمر محنتی ایمان دار، صحت مند، اور نیک مستقل میڈ کی ضرورت ہے۔ یہ تمھیں تنخواہ اور مراعات کا بتادیں گی۔''

ثمینہ سوچ میں غوطہ زن ہو گئی۔ اللہ نے ایک راستہ دکھا دیا ہے۔ بس نکل جاؤں اس دکھوں کی نہ ختم ہونے والی حیاتی سے......

جنا جی نے اُسے متفکر پا کر پیشکش کی کہ وہ اُس کے ساتھ فلاں کالونی میں اُس کے گھر تک چلے اُس کے والدین اور بچوں سے ملے اور اُس کی بابت آس پاس سے معلوم کر کے دو گھنٹے یا چار گھنٹے لے کر سکون سے سوچ کر فیصلہ بتا دے۔ اگر انکار ہو گا تو وہ اُسے دارلامان تک خود ڈراپ کر دیں گے

یہ پیشکش جنا کی ایمان دار اور قابل اعتماد ہونے کی علامت لگ رہی تھی۔ بہر حال ثمینہ نے اپنا بیگ اُٹھایا اور رسک مول لینے کا ارادہ کر لیا۔

ثمینہ اپنے شہر کے اس پوش ایریا کو جانتی تھی اُسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں بھی کوئی بھی اُس کو یا اُس کے گھر والوں کو جاننے والا / والی مل سکتی ہے۔

جنا جی کے والدین کی کوٹھی عالیشان تھی۔ باہر آفریدی نام سے تختی لگی تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ بُزرگ سفید ریش والد تھے۔ اُس کا بیٹا 17 سالہ عمر اور دو بیٹیاں 15 اور 14 سال کی تھیں۔ رسمی تعارف اور مشاہدے کے بعد وہ مہمان خانے میں بھیج دی گئی تاکہ آرام کر لے...... غسل خانے میں خود کو فریش کر کے اُس نے پلنگ پر دوپٹہ اُتار کر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے تدبُر کیا تو ایک نام ذہن میں آیا۔ شہریار جویہ اُس کی کس نوعیت کی مدد کر سکتا ہے۔

جویہ کا نمبر (کارڈ سے دیکھ کر) ملایا۔

''بہت اچھا کیا۔ آپ نے رابطہ کر لیا۔ میں آپ کے لیے بہت پریشان تھا''

''کیا آپ خیر پور جنوبی میں ہیں؟ کیا آپ نے میری ثمامہ دیکھی ہے...... کیا آپ مجھے میری بیٹی دلوا سکتے ہیں؟''

''ثمینہ جی...... آپ یہ بتائیے آپ اس وقت کہاں ہیں کیونکہ آپ اپنے والدین کے گھر نہیں پہنچی۔''

جواب میں ایک متذبذب خاموشی پا کر کہا۔

''میں آپ کو ایک بُری خبر سنانے والا ہوں......''

ثمینہ تڑپ کر سیدھی ہو گئی۔ دماغ کو کچھ سمجھ نہ آیا۔

''کیا خبر...... ہے؟''

''آپ کی بچی...... ثمامہ فوت ہو گئی ہے''

''کیا مطلب؟ کیا کہا؟ آپ کو کیسے پتا''

بوکھلاہٹ لفظوں سے عیاں تھی۔

''میں سچ بتا رہا ہوں۔ اس وقت آپ کے گھر سے کچھ فاصلے پہ کھڑا ہوں ثمامہ کے نانا نانی لوگ پہنچ چکے ہیں۔ آپ کی طلاق کی کہانی یہاں ہر کسی کے منہ پہ ہے......اور''

”میری شامی ...... مرگئی ...... اتنی جلدی وہ مر ہی گئی...... اُسے بھی مار دیا ہوگا قاتل مجید نے ......“ اُس کی آواز غم سے پھٹ رہی تھی مگر اچانک اُس نے ہنسنا شروع کر دیا ”اچھا ہی ہوا...... مر گئی...... روز مرتی...... ایک بار مرگئی مگر وہ...... کیسے“

”ثمینہ جی...... صبر کریں۔ حوصلہ رکھیں۔ آپ بہت صابر خاتون ہیں۔ یہاں کہا جارہا ہے کہ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اُس نے کچھ نہ کھایا پیا...... اُس کا باپ اُسے پچکارتا تو پیلی زرد ہو کے کانپنے لگتی۔ پڑوسن ریحانہ باجی نے میری بھابی کو احوال دیا۔ بھابی کو میں نے تعزیت کے لیے بھیجا ہے تاکہ معلومات حاصل ہوں۔ وہ دری پہ ست کر پڑی رہی اُسی رات سے آج شام تک...... آنکھیں نہیں کھولتی تھی۔ خوف سے دل بند ہو گیا بچی کا......“

”ہائے کیا کہہ دیا...... ہائے میری بچی میری گود میں چھپنے کو ترستی مرگئی...... ہائے میّا“

”ثمینہ جی...... اس غم کے علاوہ اس سانحے کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ آپ کے کردار پہ انگلیاں اُٹھ رہی ہیں...... مجید کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ اُس کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور وہ مزید بکواس کر رہا ہے......“

اب ثمینہ نے حالات کو عقلی سطح پر سوچا۔ اُسے یہ بھی حیرت ہوئی کہ جویریہ جیسا اچھا مرد بھی کوئی مرد ہو سکتا ہے۔ اُس نے کہا

”جویریہ صاحب...... میں نے مرد کو ہر روپ میں دیکھ لیا۔ باپ کو جابر اور ظلم مسلط کرنے والا پایا۔ شوہر کو ظالم، بداخلاق، بدکردار، بدگولا بھی پایا۔ بھائیوں کو خودغرض پایا۔ یہاں تک کہ بیٹے بھی مکمل لاتعلق اور مجھ سے بے نیاز رہنے والے بن چکے...... اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔“

”سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پہلی بار آپ کو دیکھ کر احساس ہوا تھا آپ کے ساتھ مستقل غم ہے...... میری درخواست اس وقت ناموزوں ہے مگر......“

”غم ...... مستقل غم میرا ورثہ ہے، جو مجھے باپ اور خاوند سے ملا...... مجھے سارے مردوں یا کسی اور مرد سے کیا سروکار...... اللہ نے جو تجربہ کرایا وہی میرا تجربہ ہے...... اللہ حافظ“

اور وہ فون بند کر گئی (مگر جویریہ کو تسلی تھی کہ اُس کا نمبر آچکا تھا) فون ہاتھ میں تھا۔

اور اذیت ناک مناظر اور اذیت ناک خبروں کی زد میں ثمینہ جلد از جلد سوچنا اور فیصلے کرنا چاہتی تھی۔ شامہ کی موت؟ نیزے کی اَنی کلیجے میں چبھتی تھی...... کیا اُس کے والدین بالخصوص ابا بھی اِن موتوں کے بالواسطہ گناہ گار نہ تھے...... اور اب اُسے یہ گناہ گار بنا کر والدین غش کھا رہے ہوں گے۔

اور اب ثانیہ کی کال آرہی تھی۔

”کہاں مرگئی ہو ثمینہ باجی...... تمھیں پتا ہے

شامہ......"

"مجھے سب پتا ہے۔ آگے بولو"

"اگر تم وہاں موجود ہوتی تو...... شامہ نہ مرتی...... تُم نے وہاں سے نکل کر...... مجید کے بیان کو سچا بنانے میں آسانی کر دی...... خدا کے لیے اب ہو کہاں؟"

"اگر میں وہاں موجود ہوتی...... یعنی ہزار بار کہی طلاق کے بعد حرام عورت کی طرح وہاں موجود رہتی تاکہ...... میرا میکا خوش باش انجوائے کرے...... مجھے تم پہ ترس بھی آ رہا ہے پیار بھی...... میں اپنے باپ پر تو اپنی صفائی پیش کر کے ہی اس کی دُنیا سے جاؤں گی...... ثانی! میں خودکشی نہیں کر رہی بلکہ......" اُس نے ملک چھوڑنے کے بارے میں اپنے حتمی ارادے کے متعلق ثانیہ کو بتا دیا۔

"باندھی بن کر ملک سے باہر جانا منظور نہ کرو۔ میرے پاس آ جاؤ۔ ہم کسی بھی طرح گزارہ کر لیں گے۔"

"مجھے مجیدے کی گالیوں گندے الزام کی جوتی برابر پرواہ نہیں۔ میں اُس کے منہ سے عزت دار بیوی بن کے اتنی بار کوٹھے والی، بازاری، حرام زادی سُن چکی ہوں کہ حج بھی کر لیتی تو اس کی سوچ یہی رہتی...... ثانیہ...... میں اپنے والدین کو مل کر جاؤں گی...... اور تم سے رابطہ رکھوں گی۔"

آخری فقرے اُس کا مکمل سچ نہ تھے۔

ابا کو دیے جانے والے جوابات کا وزن اتنا تھا کہ دامن میں سمیٹتی تو دامن پھٹتا تھا آنچل میں چھپاتی تو آنچل پھٹتا تھا دل میں اُتارتی تو دل پھٹتا تھا۔ جوابات کے جواب مطلوب نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے فون نہیں کیا۔

نذر محمد اپنے گھر کے آنگن کی ویرانی میں بیٹی کی عزت کا جنازہ اُٹھنے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ صوفے پر اظہر سر نیہوڑائے تو پاس ہی امّی گُم صُم بیٹھی تھیں۔ ان خاموش بتوں میں ثانیہ کی آواز نے زندگی کی لہر دوڑا دی۔ ہلچل مچ گئی۔

"پارسل آیا ہے۔ ثمینہ کی لکھائی ہے۔"

ثانیہ نے پارسل کھولا وایک موبائل گرا، پھر ایک لفافہ گرا۔ ثانیہ نے موبائل کی پرواہ کرتے ہوئے جلدی سے لفافہ کھولا۔

"امّی...... میں ثمینہ ہوں جسے جنم دینے پہ آپ اس وقت پچھتا رہی ہوں گی

ابا...... میں ثمینہ ہوں آپ کے سینے کا بھاری پتھر جسے ہٹاتے ہٹاتے آپ تھک گئے اور اب ہمیشہ کے لیے ہٹ گئی۔

میری دونوں بیٹیاں مرگئیں۔ الحمدللہ یہ الحمدللہ آپ کے نصیب میں نہ ہونے کا پُرسا دیتی ہوں۔ میری چھوٹی بیٹی امامہ کو اُس کے باپ نے دوا کی دس گُنا زیادہ ڈوز دے کر مار دیا۔ جب اُسے میں نے یہ بتایا تو اُس نے مجھے زدوکوب کر کے طلاق دے دی۔ میری بڑی بیٹی شامہ مجھ سے زبردستی چھین کر مجھے رات و گھر سے نکال دیا۔ میں نے رات پڑوسن کے گزار کر صبح میں نے نام نہاد میکے اور اُن کی دُنیا سے بہت دُور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ثامہ کو باپ کا خوف اور وحشت نے مار دیا۔ مجید اُن دونوں کا قاتل ہے۔ پرانے گیتوں میں ہوتا تھا بابل کا ویڑا چھوڑتی بیٹیاں بابل کی شفقت کو روتی تھیں۔ بھیا کے جھولے جھلانے کو یاد کرتی تھیں۔ میا کی دعاؤں کو سمیٹتی تھیں مگر یہ سب باتیں ثمینہ کے لیے کس متروک زمانے کی باتیں تھیں علیشا اور ثانیہ کے لیے نہیں، میں اسے اپنا نصیب کہہ کر آپ کو قصور سے آزاد نہیں کروں گی۔

آج مجھے کہنا ہے کہ اُن سنگ دل کٹھور باپوں سے جو بیٹی کی زندگی کا فیصلہ اپنے اندھے اشتعال یوں کرتے ہیں گویا بیٹی نہ تھی ٹھیکری تھی جسے جوتے کی نوک سے اُچھال کر گندی نالی میں پھینک دیا۔

ابا...... آپ نے کچی دیواروں والا چھپر نما وہ گھر دیکھا تھا جو دُور دراز کے دیہات میں تھا۔ مجیدے کو دیکھا تھا جو سات جماعتیں پاس آوارہ بیکار بندہ تھا (جس کی بہن کو آپ نے ایم ایس سی کرائی۔ آپ کی نیکی کو داد ہے) وہ میدا جسے غسل طہارت کی تربیت نہ تھی بے دریغ گالیاں بکتا تھا۔ آپ کا دل نہ رویا؟ نہ میری شریف تابعدار ماں کا دل رویا؟ میں نے ڈھور ڈنگر جیسی زندگی کے چودہ سال گزارے۔ چودہ سال عمر قید ہوتی ہیں۔ مجھے آپ کو نہیں سنانا کہ میری تنخواہ وہ چھین لیتا تھا۔ میری مرنے والی بچی ٹافیوں کو ترستی مرگئی، مجھ پر ہر نوکر، چوکیدار، ڈاکٹر، اُس کا بھائی نوید سے بدکرداری کا الزام تھا۔ جب بھی آپ کی طرف آئی آپ نے مجھے بہلا کر تحفے دے کر دھکیل آئے۔

میرا قصور کیا تھا؟ ابا مجھے جواب دو۔ میرا قصور یہ تھا کہ گلی میں اجنبی لڑکا مجھے زبردستی رسالہ دے رہا تھا۔ آپ نے میرا جواب تک نہ سنا اور مجھے جلاوطن کر دیا۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کے بیٹے اور علیشا کا عشق پروان چڑھتا رہا آپ نے اُن کے عشق کو دو طرفہ خرچ کرے دھوم دھام سے انجام پر پہنچایا۔

شاید آپ کا دل دُکھے۔ آنکھ نم ہو......

مگر اب یہ آنسو میرے لیے کوئی مداوا نہیں۔

جب آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہوں گے ثمینہ غیروں کی باعزت کنیز بن کر آپ کے دیس کو الوداع کہہ چکی ہوگی۔

امی...... دُنیاداری میں کوئی سا بہانہ بنا دینا۔ کہہ دینا بہت سے ریال پہ ڈسپنسر کی نوکری مل گئی تھی طلاق کے بعد چلی گئی۔ کچھ عرصے بعد میری اچانک موت کا اعلان کر دینا۔ لیجیے آپ کا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ مرگئی مردود فاتحہ نہ درود۔

ثانیہ...... موبائل کا عقدہ ضرور کھول دینا ورنہ میری سنگساری کا عمل تمھارے والدین کے ہاتھوں جاری رہے گا۔

ثانیہ...... تُم ثمینہ کی حیات ثانی ہو، تمھاری خوشیوں میں جیوں گی...... عفان وجدان کو ہو سکے تو نذر محمد، مجیدا نہ بننے دینا۔

☆☆☆☆☆

تڑپ ہے تیرے لیے

جس اوج تو نے
اٹھایا ہے پرچمِ پندار
سلام کرتی رہیں گی غزہ
تجھے صدیاں
یقینِ بدر و احد
تجھ کو آفریں کہے
ہے کربلا بھی ترے
صدق و صبر پہ نازاں
ترا لہو نئی
تقویم کی اساس ہوا
بدل کے رکھ دیا
سب تو نے تار و پودِ جہاں
کھنڈر بنا دیا
ظلمت نے راکٹوں سے جو شہر
اُسی سے تو نے نکالے
نئے زمان و مکاں
تری اذاں نے جگائے
یگوں کے سوئے ہوئے

تری فغاں نے کیا
دیر کے رکوں کو رواں
روئیں روئیں میں
جلالی تڑپ ہے تیرے لیے
قلم عَلَم ہے مرا
شعلہ و شرر ہے زباں

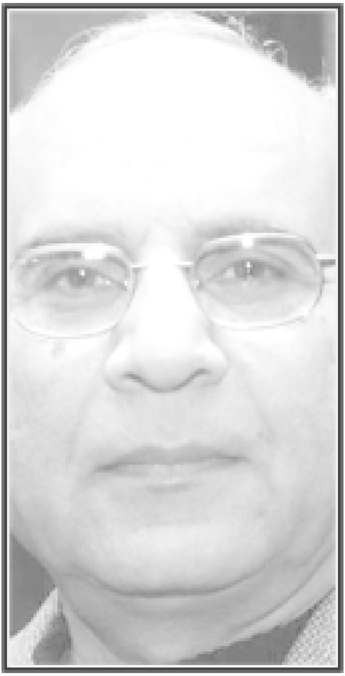

جلیل عالی

محبت

محبت لفظ ہے ایسا جسے پرکھا نہیں جاتا
جسے تولا نہیں جاتا
محبت دو دلوں کے قُرب کا
ایسا وسیلہ ہے
جسے رنج والم اور حرزِ جاں سے خاص نسبت ہے!

محبت اک کسک ہے، درد ہے
اُفتاد ہے ایسی
جسے محسوس کرتے ہی نگاہوں میں
عجب سی جھلملاہٹ عود آتی ہے!
محبت لفظ ہے، احساس ہے، بحرِ معانی ہے
محبت کرب ہے، ارمان ہے، سوزِ نہانی ہے

محبت میں زباں خاموش رہتی ہے
نظر سے بات ہوتی ہے
محبت خود ستم ایجاد کرتی ہے
ستم کو مات دیتی ہے

محبت اک فسوں ہے جو
محبت کرنے والوں کو

سدا اپنی تاب رکھتا ہے
مثالِ بادہ و تلخاب رکھتا ہے!
محبت ہجر بھی ہے
وصل بھی ہے اور سب کچھ ہے

محبت اک الاؤ ہے
جو بجھ کر بھی لپکتا ہے
لپک کر بجھ بھی جاتا ہے
مگر پھر بھی
محبت کرنے والوں کو حضوریاب رکھتا ہے
ابد آباد رکھتا ہے!!

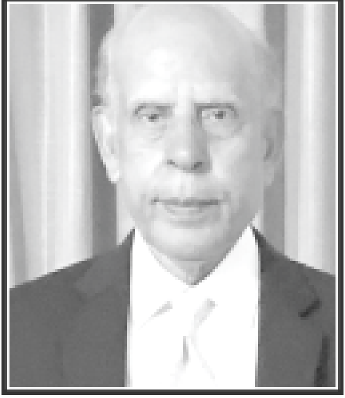

سید افسر ساجد

راستوں کی حیرت

راستوں کی حیرت سے آشنا کہاں ہوتا
منزلوں کی خواہش میں،
صورتوں کی چاہت میں،
راحتوں کے چہروں پر پھیلتے نقابوں میں
دوریوں کی نادیدہ چادروں کے سائے میں
راستوں پہ یوں سرپٹ بھاگتا رہا ہوں میں
راستوں کی حیرت سے آشنا کہاں تھا میں

جسم و جاں کے اندیشے
نارسائیوں کے دُکھ
چاہتوں کے جنگل میں گُم نشانیوں کے دُکھ
دم بخود ہواؤں کی بینوائیوں کے دُکھ
شہرِ شب گزیدہ سے آشنائیوں کے دُکھ
کج ادائیوں کے دُکھ
مہربانیوں کے دُکھ
اجنبی جزیروں سے لوٹتے پرندوں کی
بے زبانیوں کے دُکھ

خواہشِ سفر نے کب فُرصت نظر دی ہے
کَون کس طرف لوٹا، کس نے کیا خبر دی ہے
راستوں کی حیرت سے یہ تو پوچھ سکتا تھا
حاصلِ سفر کیا ہے؟
میں بھی سانس لینے کو رُک کے دیکھ سکتا تھا
راستوں کی حیرت سے کچھ تو سیکھ سکتا تھا

فیاض تحسین

اگر تم لوٹ آؤ تو

محبت کی قسم جانم
اگر تم لوٹ آؤ تو
تمہارے لوٹ آنے سے
ذرا سا مسکرانے سے
ہنر یہ آزمانے سے
کبھی ملنے ملانے سے
یہ میرا دل دلِ مردہ
دھڑک سکتا ہے سینے میں
وہ شعلہ زندگی کا پھر
بھڑک سکتا ہے سینے میں
تمہیں ادراک ہے اسکا
محبت کیمیائی ہے محبت اولیائی
محبت ہی تو ہے جس نے
تمہارے ابروؤں سے میری سانسیں باندھ رکھی ہیں
ترے ماتھے کی شکنوں سے
مری سانسوں کا یہ دھاگہ اچانک ٹوٹ سکتا ہے
سرا سانسوں کا میرے ہاتھ سے پھر چھوٹ سکتا ہے
تم اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو تو جانِ من
وہ چشمہ زندگی کا پھر سے مجھ میں پھوٹ سکتا ہے
چراغ زندگی کو کب جلانا ہے بجھانا ہے
کہاں تک ساتھ جانا ہے
کہاں سے لوٹ آنا ہے
یہ سب ہے منحصر تم پر
محبت ابنِ مریم کی مسیحائی سے شافی ہے
محبت ایسا پارس ہے جسے چھو لے وہ سونا ہے
محبت سے بڑا تریاق دنیا میں نہیں کوئی
مری پوروں سے جسم و جاں کے ہر اک ریشے ریشے تک
مری رگ رگ میں خال و خد میں
سرسے پاؤں تک جانم
محبت ہی محبت ہے
کبھی آنکھوں سے گزرو تو
کبھی اس دل میں اترو تو
متاعِ ذات کی ساری قلمرو میں جدھر دیکھو
بدن کی سلطنت میں جس طرف نظریں گھماؤ تو
تمہاری حکمرانی ہے
ترے سانسوں کی حدت سے
ترے جذبوں کی شدت سے
تمہاری گرمجوشی سے
تمہارے لمس کو پا کر
ترے پہلو میں گم ہو کر
ترے چہرے کے پرتو سے
تری باتوں کے جادو سے
تمہاری گفتگو کے رس سے
زیرِ لب تبسم سے
ترے حرفوں کی امرت سے
ترے لہجے کی خوشبو سے
تمہارے ناز سے انداز سے اطوار سے جانم
یہ میرا دل دلِ مردہ
دھڑکنے کی دوبارہ سے جسارت کر بھی سکتا ہے
مری جاں مختصر یہ ہے
مرے دل کو دھڑکنے کے لیے تیری ضرورت ہے
فقط تیری ضرورت ہے

مسعود احمد

ایڑیوں پر جُھکا ہوا چشمہ

چھاگلیں
اس کو ڈھونڈ رہی تھیں

پانیوں کا نمکین کسیلا ریلا
پیچھا کرتا
آنکھ
اشارہ
دیکھتا ٹوٹتا تارا
سوچتا
کالی کُٹیا کا زردیلا بھید

چُومتا
ہے
پنڈلی پنڈلی
منظر

جُھکا ہوا ہے
ایڑیوں پر چشمہ

حیلہ جُو
ناراض
ہٹیلا
رُکا ہوا ہے وقت کا کالا غزال
کھول کے لانبے بال

محراب کا سرخاب اور خوشبو

تتلی پائیں باغ کی تتلی
آہ بھرتی ہے
اک مہک کے لیے
پوری پہنائی کی جھلک کے لیے

کب تلک یہ اڑک چھوا بسرام
گھورتی ہے رہائشِ بے نام

چپ کی شب میں
پرندے مل کر
درو درماں کو کوئی بتائے بغیر
شاخ در شاخ ڈھلنا چاہتی ہے
اپنے پاؤں پہ چلنا چاہتی ہے
خوشبوئے یار
بند مٹھی کے
چڑیا گھر سے نکلنا چاہتی ہے

تنویر قاضی

تم سے بچھڑ کر......!

احمد جلیل

تم سے بچھڑ کر
یوں لگتا ہے
جیسے میرا اب جیون سے
ہر اک ناتا ٹوٹ گیا ہے
جیون مجھ سے روٹھ گیا ہے
اب تو ایک ہی آس ہے باقی
آنے والا وقت کبھی گر
تجھ کو منا کر
ان راہوں پر، جو تیرا رستہ تکتی ہیں
لے آیا تو
پھر جیون کے
سارے روٹھے موسم
من جائیں گے
اجڑے اجڑے سارے منظر
سج جائیں گے
لیکن یہ کیونکر ممکن ہے!

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

وہ ایک رات کہ مائیں بچھڑنے لگتی ہیں
وہ ایک صبح کہ مانگیں اُجڑنے لگتی ہیں

محمد ارشاد کے لیے

امیر حسین جعفری

ہوائے شام
کس کے عکس کی خوشبو
سرِ شاخِ وفا لائی
کنارِ چشم رودادِ محبت ہے کہ
سطرِ آب روشن ہے
وہی سطریں
تری تقلید میں جن کو پڑھا میں نے
اور ان کو معتبر مانا
ہوائے شام کا لہجہ غمِ نو ہجر کی تفصیل رکھتا ہے
کسی تمثیل میں تم ہو
کسی اجمال میں ، میں ہوں
کہیں قرطاسِ خالی کا وہ بے عنوان ساحل ہے
جہاں پیکر کسی گمنام سے سائے میں ڈھلتے ہیں
ترا دستِ ہنر پہچان کے زرتار سے
کتنے حسیں پیکر بناتا ہے
ہجومِ رنگ میں روشن
گلِ نو رنگ سے شامِ وصالِ یار کی زلفیں سجاتا ہے

گریز

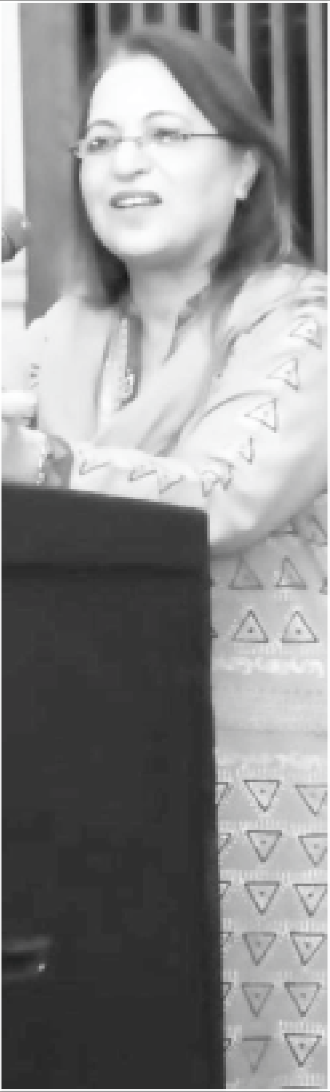

ہمارا مسکرانا

ہر اک لمحہ، ہر اک ساعت مسلسل مسکرانا
باعثِ حیرت ہوا ہے!
اگر اطراف میں پھیلے ہوئے نشاط آگیں
مہکتے شادمانت لمحے
تو ہونٹوں پر تبسم، آبشاروں کی رواں نرمی
لیے چھن چھن چھناتے ہیں
پرندے تنکا تنکا رنگ چن کر
لبِ خوش کے کنارے آشیاں اپنے بناتے ہیں
مگر چاروں طرف پھیلے تعفن دُکھ کے باسی
پنِ نظر کے خشک تالابوں کے کونوں پر
جمی کائی کے موسم میں بھی......
اپنے زرد ہونٹوں پر تبسم چُرا تے ہیں
لبوں کے زاویے اُلجھے ہوئے دھاگوں کی
صورت سرسراتے ہیں
ہمارا مسکرانا مسلسل مسکرانا باعثِ حیرت ہوا ہے
تبسم کو جو ہم نے ذات کی پکی نشانی کر لیا ہے
تو کوئی جانتا کم ہے کہ مسکاہٹ سرِ لب،
زیرِ لب رکھ کر
جو ہم پر ہنسنے والے لوگ ہیں
ان سے فقط خود کو بچاتے ہیں
مسلسل مسکراتے ہیں

رخشندہ نوید

پسِ خاک سے سرِ شاخ تک (نثار ترابی کے لیے)

علی ارمان

مرے شہرِ خواب وخیال کا
کوئی گھر بھی ایسا نہیں جہاں
ترے موسموں کی مہک نہ ہو
مرے شہرِ خواب وخیال کی
کوئی صبح ایسی نہیں جسے تری ضو نے
قرض دیا نہ ہو
کوئی شام ایسی نہیں جہاں پہ شفق نہ ہو
تری یاد کی
کوئی رات ایسی نہیں جہاں تری چاندنی
کی چمک نہ ہو
مرے لفظ تیری محبتوں کا خمیر ہیں
مرے سانس تیری رفاقتوں کے اسیر ہیں
مرے ہم یقیں مرے ہم گماں،
مرے مہرباں مرے باغباں
پسِ خاکِ زندگی آرزوئے نمو کہیں تھی
مری ہوئی
ترے سبز لہجے کے لمس سے مری سوکھی
ٹہنی ہری ہوئی
مری جھولی اب ہے بھری ہوئی
گلِ اعتبار و اُمید سے

نظم

روشنی! آ گہی!
آ گہی! روشنی!
رات کی وسعتوں میں
کوئی روشنی؟
دیکھ لیں اپنے ہونے کا ہم بھی نشاں
ہم جو منظر میں اب تک
کہیں بھی نہیں
آنکھ میں ٹوٹتے خواب کی کرچیاں
دل میں دم توڑتی حسرتوں کا دھواں
شاہراہوں پہ بکھری ہوئی زندگی
زندگی!!! بے حسی
بے حسی!!! زندگی
ذہن میں اَن گنت نقش
بنتے بگڑتے ہوئے
آئینے اپنی صورت سے
ڈرتے ہوئے
سائے ملتے ہوئے
اور بچھڑتے ہوئے
پاؤں انجان رستوں پہ پڑتے ہوئے
کچھ دعائیں
کہ سانسوں سے لپٹی ہوئیں
کچھ صدائیں
تعاقب میں چلتی ہوئیں
کیا کریں جن کی
کوئی بھی منزل نہیں
وہ جو موجود و غائب میں
شامل نہیں
ریشمی خواب گاہوں کے قابل نہیں
وہ جنھیں بے دلی کے سوا
کچھ بھی حاصل نہیں!!

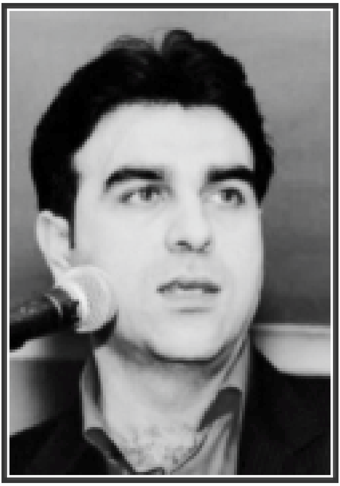

شہباز خواجہ

ماتمی لمحوں کا قہقہہ [نثری نظم]

وہم اور گمان کے درمیان
خود کو کشید کرنیوالا شخص
کب پورا ہوتا ہے
خوشبو کو چھونے
اور قہقہے لکھنے کی پاداش میں
اپنے لیے سزا کیسے تجویز کرے
موسموں کے فیصلے تو کوئی اور کرتا ہے
پرندوں کو تو ہجرت کرنی ہوتی ہے
منجمد ساحلوں سے
جاگتی جھیلوں اور بہتے جھرنوں تک
شکار زمین
اور
قاتل آسمان کے درمیان سفر کرتا ہے
تتلیوں کو کون بتائے
کہ پھولوں کے کھلنے پر پابندی ہے
مگر مائیں
بچوں کو جنم دینے کی خواہش کو
کیسے مار سکتی ہیں
خواہشوں کو مارنے سے پہلے
فطرت کا جنازہ اٹھانا ہوگا
مگر
اس کی موت کی تصدیق
کون کرے گا
عورت کے رحم میں
حقیقت پلتی ہے
وہم کی کوکھ میں شک
اور گمان
اکثر نامکمل رہتا ہے
کہ اسکا باپ
مباشرت سے قبل قتل کردیا گیا تھا

سمیع اللہ عرفی

روشنی کا مغالطہ [نثری نظم]

لوگ مرتد نہیں ہوتے
ذہن کافر
دل مُردہ ہونے پر
اجنبی خیال کی رو
اُنھیں
سوکھے پتوں کے ڈھیر
مایوسی کی آگ کے قریب لے آتی ہے

وہ جسے روشنی
علم کی طراوت سمجھتے ہیں
وقت کے دھارے میں
آخر کار
غلط فہمی ثابت ہوتی ہے
محض حقائق
سچائی کا دروازہ کھولنے میں
ناکام
معذور دکھائی دیتے ہیں

معروضی دلائل
مغالطہ تخلیق کرسکتے ہیں
جیسے مادی افکار کے طلسمات
زمانے کی ترجیحات کے غلام ہیں

مگر
روح کے تقاضے
ایمان کی ضرورت
خدا، رسول، کتاب کی
محبت
اطاعت کے بغیر ادھوری
نامکمل ہے

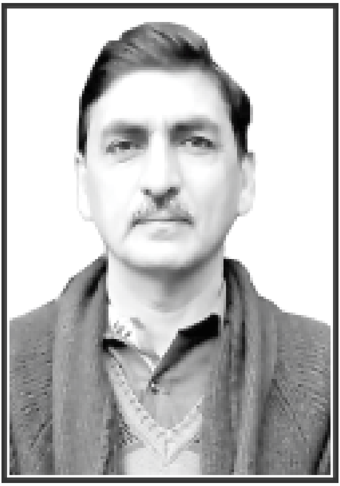

امجد بابر

علامہ اقبالؒ

سب سے ہٹ کر ہے زاویہ اُس کا
شعر پُر دُر ہے فلسفہ اُس کا

وہ زمانے کا شاعرِ اعظم
کیا کسی سے مقابلہ اُس کا

روح کی تہ میں جا اُترتا ہے
سُن کے دیکھو تو زمزمہ اُس کا

اُس نے کھولے ''خودی'' کے سب ''اسرار''
حق نما ہے مکاشفہ اُس کا

''بے خودی'' کے ''رموز'' فاش ہوئے
ذات سے ہے مکالمہ اُس کا

وہ سفیرِ ''پیامِ مشرق'' ہے
شہرہ مغرب میں جابجا اُس کا

عرب آثار ہے ''زبورِ عجم''
عالمی ہے رُخِ نوا اُس کا

رمزِ ''جاوید نامہ'' لافانی
ہے دوامی لکھا ہوا اُس کا

گونج ''بانگِ درا'' کی پھیل گئی
رشکِ منزل ہے قافلہ اُس کا

''بالِ جبریل'' یہ بتاتی ہے
ہے فلک سے سفر ورا اُس کا

ہے مؤثر کلام ''ضربِ کلیم''
زورِ ایمان، بے بہا اُس کا

بے تبرا ہنوز کچھ بونے
نہیں کرتے جو تذکرہ اُس کا

نام اسلام کا وہ لیتا ہے
یہ گنہ سب سے ہے بڑا اُس کا

میر و سودا سے، ذوق و غالب سے
کیجیے مت موازنہ اُس کا

یہ تو سب عکسِ حسنِ فطرت ہیں
اور حقیقت ہے آئنہ اُس کا

''ارمغانِ حجاز'' میں فیضانؔ
دیکھیے عشقِ مصطفیٰؐ اُس کا

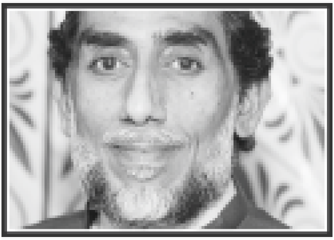

فیض رسول فیضان

”مسیحا“

بدن کے جو مسائل ہوں
مسیحا جان لیتا ہے
فشارِ خون ہو یا جسم میں حدت زیادہ ہو
ہمارے دل میں دھڑکن کی اگر شدت زیادہ ہو
وہ سب پہچان لیتا ہے
اگر اندر سے گھائل کر رہا ہو کوئی جرثومہ
مسائل ہوں دماغی یا بھلے دل کے
وہ سب کچھ جان لیتا ہے
مگر ایسا کوئی آلہ بنانے میں رہا قاصر
کہ جس سے سرد مہری ناپ سکتا ہو،
کسی کی روح پر گھاؤ
کہاں گم ہو گئے چاؤ
جو آنکھوں میں ہے ویرانی کہاں تک ہے
کہاں تک روح گھائل ہے
پریشانی کہاں تک ہے
سبب کیا ہے
اگر یہ سب سمجھ سکتا نہیں تو پھر یہی سمجھو
مسیحا کو حقیقت میں مسیحائی نہیں آتی

صغیر احمد صغیر

نثری نظم

کچھ اور طرح سے جینا تھا"

مصروفیت کتنے حسین پل نگل لیتی ہے

ہم انجان رہتے ہیں

زندگی کی دوڑ میں نجانے

ہم زندگی کہاں گنوا آئے ہیں

دوڑتے بھاگتے سانس لیتے روبوٹ

بن کر رہ چکے ہیں

جذبات اور احساسات سے عاری

فقط دیکھتے اور سنتے ہیں

کوئی زندگی سے چلا جائے

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا رہے

فرق نہیں پڑتا

ہم اپنی ذات میں مقید

اپنی ہی تلاش میں سرگرداں

نہ ختم ہونے والے راستوں پر محوِ سفر ہیں

دل اداسی سے بھرا رہتا ہے اور

آنکھیں نم

کہہ دیتے ہیں بدلتے موسموں کے

اثرات ہیں

دریا راست بدلتے ہیں تو راستے میں جو

بھی آئے

سب بہا لے جاتے ہیں

وجود کی عمارت مسمار ہو تو پتا چلتا ہے

بنیادوں میں کیا غلطی تھی

کچھ اور طرح سے جینا تھا

ہم زندگی کی تلاش میں زندگی گنوا بیٹھے

نائلہ راٹھور

دیوسائی [نثری نظم]

تمہاری شاعری پڑھ کر

میں تم سے تمہاری نظموں کی بابت سوال کرتی ہوں

تم خاموش رہتے ہو

سو، میرا تم سے جو رشتہ ہے، وہ ایسا ہے

جیسے سکردو کے بالائی میدان کے کاسنی پھول

میرے دل کی دنیا کی لہک سے بے خبر

اب تک لہلہاتے ہیں

میں کیا ہوں، کون ہوں، کہاں ہوں

نہیں جانتے

تم اور دیوسائی کے کاسنی پھول

بشریٰ شیریں

محبت

محبت افتخارِ آدمی ہے
محبت انقلابِ زندگی ہے

محبت دل جلوں کے دل کی راحت
محبت عاشقوں کی عاشقی ہے

محبت سے دوامِ نظمِ عالم
محبت دو جہاں میں گونجتی ہے

محبت سے بہاریں گلستاں میں
محبت سے گلوں میں تازگی ہے

محبت روزنِ تسخیرِ انساں
محبت ایک سرِّ مضمری ہے

محبت داستانِ کربلا بھی
محبت بادۂ حبِّ علی ہے

محبت موجبِ تحسین، مسکاں!
محبت التزامِ شاعری ہے

مسکان گل

عمرے کو وہ ہوا روانہ جب

بارے سیلاب کے بتاؤں کیا
بیش تر ساتھ لے گیا پانی
کیا مناظر دکھاؤں میں تجھ کو
ساری بربادی سامنے تیرے
الاماں الاماں قیامت ہے
حافظا و الحفیظ کے نعرے
بچنے والے تھے بھوکے پیاسے سب
جن میں بیمار بوڑھے لاغر بھی
عورتیں جن میں چھوٹے بچے بھی
حال بے حال تھے پڑوسی بھی
مرنے والے تھے سب قریبی ہی
لاشے بھی جن کے مل نہ پائے تھے
کچھ بچا تھا نہ رشتہ داروں کا
"عمرے" کو وہ ہوا ، روانہ جب
گاؤں ڈوبا ہوا تھا پانی میں

عاصم بخاری

--------------- انتخاب ---------------

- خالد احمد -

-------- نعمان منظور --------

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے ، سو ترے بعد جی لیے

فرشتوں کی تلاش

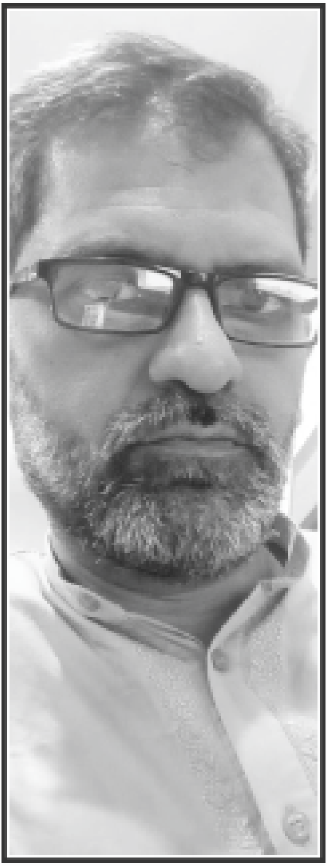

محمد عبداللہ

کچھ الفاظ میں نے
اپنے پاس لکھ رکھے ہیں
داد و تحسین پانے
لبوں پر مسکراہٹ لانے
شادیانے بجانے
زندگی کو رقص میں لانے
کی خواہش
میرے دل پر
مسلسل دستک دیتی ہے
پھر اپنی ذمہ داریوں
کی گٹھڑی اُٹھائے
یا اللہ عزوجل، یا رحمٰن، یا رحیم، یا کریم،
یا رب العالمین کو
اپنا وردِ زبان بنائے
فرشتوں کی تلاش میں
سفر پر نکل پڑتا ہوں

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ہولے ہولے ، گزر رہا تھا کوئی
جیتے جی ، روز ، مر رہا تھا کوئی

خود فریبی

کاغذی کشتی میں چند پھول سجا کر

راوی کی معرفت

تمھاری سمت روانہ کیے ہیں

مل جائیں تو

اپنی آواز کی ڈور سے باندھ کر

واپس بھیج دینا

میں راوی کنارے سمندر کی لہروں

کا منتظر ہوں

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ سفر، سر بہ سر رائیگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

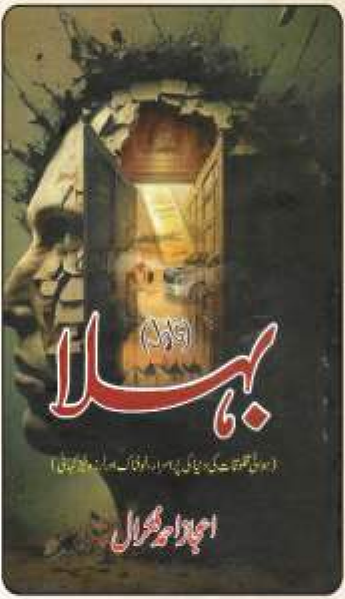
بھلا

دلِ ویران پوچھے گا

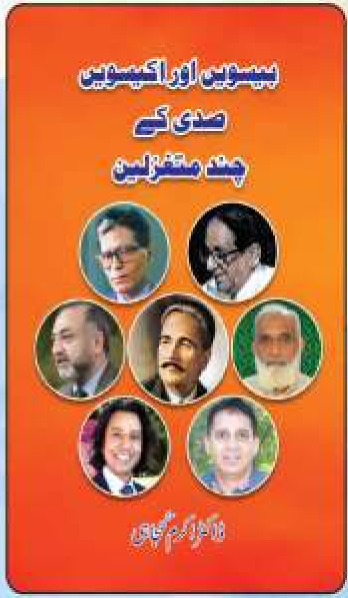
بیسویں اور اکیسویں
صدی کے
چند متغزلین

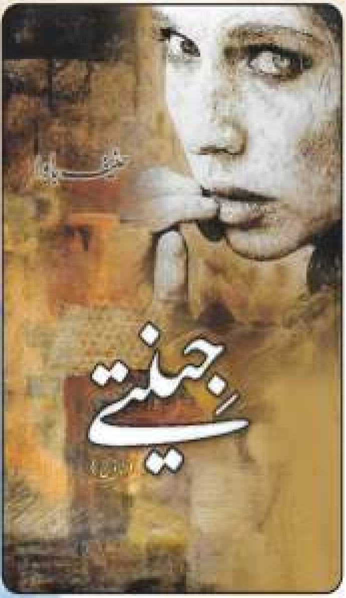
جینے

تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
پہلی صدا پرندے کی
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
نم گرفتہ
دراز پلکوں کے سائے سائے
عرض ہنر
خالد احمد